U16416.

18-12-09.

Title - BAHADUR SHAH ZAFAR YAANI AKHIRI TAJDAAR DEHLI MOHAMMAD SIRAJ UDDIN BAHDUR SHAH ZAFAR KE HALAAT-O-ZINDAGI AUR UNKI SHAYARI PAR TABSIRA.

Creator - Ameer Ahmad Alvi

Publisher - Naami Press (Lucknow).

Date - 1935

Pages - 152

Subject - Bahadur Shah Zafar - Sawaneh-e-Tanqeed; Tareekh - Hind - Mughaliya; Bahadur Shah Zafar - Sawaneh; Tazkira Shora - Bahadur Shah Zafar.

بہادر شاہ ظفر

یعنی

آخری تاجدار دہلی محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر

کے

حالات زندگی اور انکی شاعری پر تبصرہ

از

جناب منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے

پنشنر ڈپٹی کلکٹر

در نامی پریس لکھنؤ مطبوع گردید

پرنٹر: بانکے لال اسکسینہ ملازم مطبع

جولائی ۱۹۳۵ء

طبع اول

۱۸۵۷

تیموری چراغ کی آخری
روشنی ۔ جس کے بعد وہ
ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا ۔

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بہادر شاہ ظفر

تمہید

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلادیا
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بُجھادیا

یہ انگریزی حکومت کا جاہ و جلال سلطنت برطانیہ کا اقبال تھا۔ یا فوجی عدالتوں کی دارو گیر کا اندیشہ تعزیرات ہند کی سخت گیری کا خطرہ کہ بہادر شاہ کو اُنکے ہم وطنوں نے بالکل فراموش کردیا۔ مرحوم نے قید فرنگ کی مصیبتیں جھیلیں جلا وطنی کے آلام برداشت کئے حسرت و بیکسی کی موت نصیب ہوئی سہ

نہ قل ہو نہ پھُول اور نہ میلا ہے   مرا مردہ سب سے اکیلا ہے

لیکن براعظم ہندوستان کے کسی باشندے کو صدائے احتجاج بلند کرنیکی ہمت نہوئی۔ خاتم السلاطین بادشاہ بھی تھے۔ اور درویش بھی، عالم بھی تھے اور صوفی بھی، شاعر بھی تھے اور نثار بھی، رند بھی تھے اور زاہد بھی، قادر انداز بھی تھے اور شہسوار بھی، مُدبّر بھی تھے اور صادق الاقرار بھی، قوم پرست بھی تھے اور عدالت شعار بھی۔ دشمنوں کی تہمت تراشی یا پیرانہ سالی کی ایک اجتہادی غلطی نے تمام کمالات پر پانی پھیر دیا۔ غدر ۱۸۵۷ء کی فتنہ انگیز سرکار سے گمنامی کا خلعت

کنج عزلت کی جاگیر عطا ہوئی۔ اور اُنکے ہم قوم ہم مذہب اُنکے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے،

دیتے ہیں توڑ کے ٹکڑا سا مجھے صاف جواب
اے ظفر کھا کے پلے جو مرے گھر کے ٹکڑے

اُنکی دردناک زندگی انقلابات عالم کی عبرت خیز تصویر ہے اور اُنکی حسرت ناک سوانح عمری حشمت جہانگیری اور صولت عالمگیری کی سنسان تربتوں پر فاتحہ ہے!!

ادب اُردو جس کی خدمت میں مرحوم نے تمام عمر صرف کردی اسوقت ایک کتاب بھی بہادر شاہ کے حالات میں پیش نہیں کرسکتا۔ اور اُنکی ولادت و وفات کی صحیح تاریخیں بھی آسانی سے دریافت نہیں ہوسکتیں۔

مدت سے آرزو تھی کہ اس دل شکستہ شاعر کی تربت پر عقیدت کے پھول چڑھاؤں۔ اور ۱۹۲۶ء میں چند مضامین "شمع مزار" کے عنوان سے رسالہ "شمع" آگرہ میں شایع کرائے تھے۔ مگر وہ محفل ختم ہوئی۔ شمع گریاں خاموش ہوگئی۔ اور حسرت نصیب بادشاہ کی سوانح عمری ناتمام رہی۔ اب مکروہات روزگار سے فرصت ملی تو دوبارہ اس ضروری خدمت کا آغاز کرتا ہوں،

یارب مرا ثابت قدم از کوے قاتل بگذراں
من سر بجیب انداختہ اُو تیغ عُریاں دربغل

فقیر امیر احمد علوی۔ کاکوروی

۲۱۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء

سلطنت مغلیہ کا حالِ زار

اٹھارہویں صدی عیسوی کا آخری حصہ ہندوستان میں طوائف الملوکی کا نصف النہار تھا،

خانہ تھا گنجفہ کا ہر اک قصرِ شہرِ عشق
گھر گھر تھیں بادشاہیاں گھر گھر وزارتیں

حیدرآباد میں نظامِ دکن مطلق العنان تھا۔ میسور میں جداگانہ سلطنت۔ کرناٹک میں خود مختار حکومت تھی۔ مالوہ میں سندھیا اور ہلکر کا راج تھا۔ کاٹھیاوار میں گیکوار اور وسطِ ہند میں بھونسلا کی عملداری تھی۔ پیشوا کا دربار پانی پت کی تباہی فراموش کرکے کوس لمن الملکی بجا رہا تھا۔ راجپوتوں کی ریاستیں مرہٹوں سے دست وگریبان لیکن مرکزی حکومت سے سرتابی میں ہم آہنگ تھیں، بنگالہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تصرف میں تھا۔ اودھ کا وزیر روہیلکھنڈ کو علاقہ مفتوحہ اور الہ آباد کوڑہ کو صوبجات ملوکہ میں شامل کرکے بادشاہی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ دوآبہ پر جاٹوں مرہٹوں اور افغانوں میں نبرد آزمائی تھی۔ پنجاب پر سکھوں کا تسلط تھا۔ اور بادشاہی شاہ عالم "از دلی تا پالم" رہ گئی تھی۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں پر آنکھ میں دم ہے
رہنے دے ابھی ساغر و مینا مرے آگے

کل کی بات ہے کہ دلی کا اقبال شاہنشاہی ہر نیم روز کی طرح تاباں و درخشاں تھا۔ ہمالیہ کے دامن سے راس کماری تک اور آسام کی پہاڑیوں سے مغربی کوہستان تک تمام جزیرہ نمائے ہند سلاطین مغلیہ کے دبدبہ سے لرزہ براندام تھا۔ اورنگ زیب کا خلف اکبر شہزادہ معظم تختِ جہانبانی پر جلوہ افروز ہوا تو "شاہ عالم بادشاہ" کا لقب اختیار کیا۔ اور زبان مبارک سے جلوس کی تاریخ "ما آفتاب عالم تابیم" ارشاد فرمائی۔ اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ چند سال کے

اندرا جزا السلطنت پراگندہ شیرازۂ شہنشاہی ابتر ہو جائیگا۔ دار السلطنت کی شوکت سکرات جانکنی میں گرفتار ہو گی۔ ظریفوں کی فال بد جنھوں نے شہزادہ معظم کا سال جلوس "شہرِ بے خبر" ۱۱۱۹ھ قرار دیا تھا یہ حال بدلائے گی۔ کہ "آفتاب عالم تاب" کا پر پوتا عالی گوہر "شاہ عالم ثانی" کے لقب سے اورنگ فرمان روائی پر متمکن ہوگا۔ تو دلی کی خود مختاری ختم ہو جائیگی۔ اور مرزا ابوظفر "بہادر شاہ ثانی" کے لقب سے آبائی مسند پر قبضہ کرینگے تو حکومت اور ریاست کا نام بھی نہ رہے گا۔

شاہ عالم

ہماری درد بھری کہانی ۱۷۷۵ء سے شروع ہوتی ہے۔ اُسوقت اکبر و جہانگیر کے تخت پر شاہ عالم ثانی تسبیح خوانی کر رہا تھا مرزا جہاندار شاہ عرف جواں بخت ولی عہد سلطنت تھا۔ اور نجف خاں ایرانی امیر الامرا، یہ بادشاہ اورنگ زیب سے چوتھی پشت میں تھا یعنی شاہ عالم ثانی بن عالمگیر ثانی بن جہاندار شاہ بن شاہ عالم بہادر شاہ اوّل بن سلطان محی الدین اورنگ زیب اور عالمگیر کی وفات سے صرف ۲۱ سال بعد ۲۵ر جون ۱۷۲۸ء کو ایک ہندوستانی عورت لال کنور نام کے بطن سے پیدا ہوا تھا عنفوان شباب میں تیغ زنی اور کشور کشائی کا شوق رہا تھا۔ تسخیر بنگالہ کی فکر دامن گیر تھی۔ کہ والد ماجد کے مقتول ہونے کی خبر ملی اور ۴ر جمادی الاول ۱۱۷۳ھ کو حوالی عظیم آباد میں اورنگ فرماں روائی پر جلوس فرمایا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد پورب کی آب و ہوا نے تاثیر دکھائی۔ ہندوستان کا خون رنگ لایا تاتاری تہوّر اور تیموری دلاوری کا خاتمہ ہوا۔ بکسر کی مشہور لڑائی میں شکست پا کر انگریزوں سے صلح کر لی اور مشرقی صوبوں کی دیوانی فرنگیوں کے نذر کر کے سات برس تک اُن کی سنگینوں اور کرچوں کے سایہ میں بمقام الہ آباد عیش و عشرت کی داد دیتا رہا۔

صبح اُٹھ جام سے گذرتی ہے   شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے   اب تو آرام سے گذرتی ہے

(بادشاہ سلامت شاعر بھی تھے اور آفتاب تخلص تھا۔ مندرجۂ بالا اشعار انھیں کی یادگار ہیں)

سلطنت دہلی کی عظمت و شوکت اسقدر باقی تھی کہ اودھ کا نواب وزیر شجاع الدولہ اکثر حضور اقدس کی زیارت کے لئے الہ آباد آتا تھا۔ بلکہ ایک بار بادشاہ جہاں پناہ نے بھی فیض آباد کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا اور شجاع الدولہ کو لوازم مہمانداری بجالانے کا موقع دیا تھا۔ قیصر التواریخ کا مؤلف لکھتا ہے کہ ایک دن بادشاہ رونق افروز لال باغ تھے زبیل تفرج تخت پر سوار گلگشت کو نکلے شجاع الدولہ پیادہ جلوسواری میں تھے بعد ہواخوری جب تخت سے اُترنے لگے اتفاقاً بادشاہ کا چرن بردار پیچھے رہ گیا تھا شجاع الدولہ نے اپنی کفش نذر کی بادشاہ نے پہن لی اور شجاع الدولہ خود برہنہ پا ساتھ چلے جب چرن بردار حاضر ہوا تو بادشاہ نے شجاع الدولہ کو اشارہ کیا نواب وزیر نے نذر دی آداب بجالایا اور کفش شاہی بہ تفاخر بجائے کلغی کے اپنے سر پر باندھی!! تقدیر کی گردش نے وہاں بھی چین نہیں دیا۔ مرہٹوں نے جوڑ توڑ لگائے اور بارہ برس کی جلا وطنی کے بعد ۱۱۸۵ھ میں عید رمضان کے دن جبکہ اتفاق سے عیسائیوں کا بھی بڑا دن تھا (یعنی ۲۵۔ دسمبر ۱۷۷۱ء) دارالسلطنت میں واپس آیا اور لال قلعہ میں بیٹھ کر عظمت اسلاف کی مجاوری کرنے لگا۔ خوشامدیوں نے غل مچایا کہ ؎

زینت دہ تاج و تخت شاہ عالم   با دولت و بخت و کامیابی آمد
تاریخ ورودا وز ہاتف جستم   گفتا کہ ز شرق آفتابی آمد

لیکن بادشاہ کے ساتھ نہ تو دولت تھی نہ کامیابی بخت کا حال اس سے ظاہر ہے کہ قطعہ کے آخری مصرعہ سے سن مقصود بھی حاصل نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں ہاتف غیب نے کیا تعمیہ تخرجہ لگا کر تاریخ ورود ارشاد فرمائی تھی!!!

احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت کے بعد اپنے وطن کو واپس جانیسے پہلے شاہ عالم ثانی کو ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا اور شجاع الدولہ صوبہ دار اودھ کے لئے وزارت نواب نجیب الدولہ روہیلہ کے لئے امیر الامرائی کی سفارش کی تھی شاہ عالم اُسوقت دلّی میں موجود نہ تھا اسلئے نجیب الدولہ کو دار السلطنت کا منتظم اور جہاندار شاہ خلف شاہ عالم کو بادشاہ کا نائب مقرر فرمایا تھا۔ وزارت مآب موروثی صوبہ میں مقیم رہے بادشاہ سلامت مشرقی علاقوں میں سیر و تفریح فرماتے رہے نائب السلطان کو آج کل کے یوروپین بادشاہوں کی طرح اُمور مملکت کے سیاہ سفید میں کچھ دخل نہ تھا صرف نام کے جہاندار تھے دلّی پر نجیب الدولہ کی حکومت رہی اور اُسنے آٹھ برس تک بڑی بیدار مغزی اور دلیری سے شمالی ہندوستان میں امن قائم رکھا۔

جب مرہٹوں کی فوجی قوت سنبھلی اور افغانوں سے جنگ پانی پت کا عوض لینے کو اُنھوں نے دوبارہ شمال کا رُخ کیا تو نجیب الدولہ نے مقابلہ کی طاقت نہ دیکھکر اس شرط سے صلح کر لی کہ شاہ عالم جو الہ آباد کے قلعہ میں انگریزوں کا وظیفہ خوار ہے دہلی واپس بلایا جاوے اور اُسکی سرکار سے پیشوا کو اقلیم ہند میں وسیع اختیارات تفویض کئے جائیں۔ صلح کے بعد نجیب الدولہ خود مرہٹوں کے کیمپ میں گیا اپنے لڑکے ضابطہ خاں کا ہاتھ تو کوجی ہولکر سپہ سالار اندور کے ہاتھ میں دیکر اُن قدیم تعلقات کی تجدید کی جو تو کوجی کے پیشرو ملہر راؤ ہولکر اور نجیب الدولہ کے درمیان جنگ پانی پت کے زمانہ بلکہ اُسکے پیشتر سے تھے (جس کی تفصیل کتب تواریخ ہند میں درج ہے) اور اس ترکیب سے والیان اودھ کی وزارت کی طرح امیر الامرائی کا عہدہ نوابان روہیلکھنڈ کے لئے موروثی بنانے کی کوشش کی۔ شاہ عالم کو واپس بلانے کے لئے کاغذی گھوڑے دوڑائے جا رہے تھے کہ ۴ر اکتوبر ۱۷۷۰ء کو نجیب الدولہ مرگیا۔ ضابطہ خاں نے دوآبہ اور روہیلکھنڈ پر قبضہ کر لیا اور باپ کی جگہ دہلی پر بھی

متصرف ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں قلعہ شاہی کی بیگمات سے اُسنے شرمناک تعلقات
پیدا کئے اور باز پرس کے خوف سے شاہ عالم کی ہزیمت فرلی سنتے ہی دار السلطنت سے
فرار ہو گیا جب بادشاہ مرہٹوں کے قول و قرار پر اعتماد کر کے "با دولت و بخت و کامیابی" دلی میں
رونق افروز ہوئے تو ٹوکوجی نے ایفاے عہد کے لئے ضابطہ خاں کو بلا کر عفو تقصیر کے لئے حضور
سلطانی میں پیش کرنا چاہا لیکن اُسکو منہ دکھانے کی ہمت نہوئی اور نجیب آباد کے پاس اپنے قلعہ
پتھر گڈھ میں بیٹھا رہا مرہٹوں کے دوسرے جنرل مادھوجی سندھیا کو غمازی اور بدگوئی کا
موقع ملا اور اُسنے شاہ عالم کو ساتھ لیکر روہیلوں پر چڑھائی کر دی۔ شجاع الدولہ عرصہ سے روہیلوں کو
تباہ کرنے کی فکر میں تھا اُسنے چالاکی سے ضابطہ خاں کو مدد نہ پہونچنے دی اور بہادر نجیب الدولہ
کا ناکردہ کار لڑکا پتھر گڈھ سے ایسا بدحواس اور سراسیمہ بھاگا کہ اپنے اہل وعیال کو بھی ساتھ
نہ لے جا سکا بے شمار دولت مرہٹوں کے ہاتھ آئی اور ضابطہ خاں کے زن و فرزند اسیر ہو گئے

انھیں قیدیوں میں ضابطہ خاں کا بڑا لڑکا غلام قادر بھی تھا جس کو بادشاہ نے ان گستاخیوں
کی پاداش میں جو امیر معزول نے محلات شاہی میں کی تھیں یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ مرہٹوں کے
سپہ سالار نے اپنی ٹانگ کی عوض میں جو پانی پت کے میدان سے فرار کے وقت ایک
افغانی سوار نے توڑی تھی مقطوع النسل بنوایا ضابطہ خاں بھاگ کر شجاع الدولہ کے پاس
پہونچا اور مرہٹوں کی خوشامد شروع کی کہ وہ بادشاہ سے قصور معاف کرا کے آبائی عہدہ پھر دلادیں
اتفاق سے مادھوجی سندھیا کو دوسری ریاستوں کی طرف جانے کی ضرورت پیش آئی ٹوکوجی کو
سفارش کا موقع ملا اور ضابطہ خاں کی امیر الامرائی بحال ہو گئی۔

شجاع الدولہ کا دانت روہیلکھنڈ کے زرخیز علاقہ پر تھا اُس کو ضابطہ خاں کا جاہ و منصب
ناگوار ہوا اُیسٹ انڈیا کمپنی کے بعض ملازموں کو ہم خیال بنا کر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ ضابطہ
خاں معزول کیا جائے اور عہدۂ امیر الامرائی مرزا نجف خاں کو جو شجاع الدولہ سے قرابت

رکھتا تھا عطا ہو۔

مرہٹے اپنی خانگی مشکلات کی وجہ سے دکن واپس جا چکے تھے شاہ شطرنج ضابطہ خاں سے بیزار تھا شجاع الدولہ وزیر کی شہ نے سمند ناز پر تازیانہ کا کام دیا نجف خاں بازی لے گیا اور ضابطہ خاں باغی ہو کر جاٹوں سے جا ملا نجف خاں فاوار عالی ہمت دلیر اپنی ماں کیطرف سے سید باپ کیطرف سے صفوی ایران کے خاندان سلطنت سے تعلق رکھتا تھا اٹھارہ برس کی عمر میں ہندوستان آیا بہن کی شادی شجاع الدولہ کے خاندان میں کی شاہ عالم کا زمانۂ جلا وطنی میں رفیق ہوا اور اسکے ساتھ الہ آباد سے فوج کا سپہ سالار ہو کر دہلی آیا یہاں ذوالفقار الدولہ کا خطاب ملا اور آخر کار منصب امیر الامرائی نصیب ہوا۔

ولادت ظفر

ان واقعات کی تفصیل شاہ عالم کے مورخ کا فرض ہے۔ ہم کو تو اس داستان پارینہ سے صرف اتنا تعلق ہے کہ جب بادشاہ کو "بن باس" سے واپس آئے چار برس ہو چکے تھے یہ وفادار ایرانی النسل امیر الامراء دہلی کا منتظم تھا اور مسلمانوں کی پراگندہ قوت کو مجتمع کرنے کی فکر کر رہا تھا کبھی دوآبہ میں جاٹوں سے لڑتا اور کبھی پنجاب میں سکھوں سے نبرد آزما ہوتا تھا۔ ۲۸- شعبان ۱۱۸۹ھ (مطابق ۱۷۷۵ء) کو منگل کے دن شاہ عالم کے دوسرے بیٹے مرزا اکبر شاہ کے محل میں مسماۃ لال بائی ایک ہندو نژاد عورت سے وہ بچہ پیدا ہوا جسکی پیشانی پر نوشتۂ تقدیر تھا کہ یہ مولود سلطنت تیموریہ کو کشاکش حیات سے دائمی نجات دیگا اور عظمت بابری صولت اکبری شوکت جہانگیری کو وہ گہری نیند سلائیگا جسکے بعد کبھی بیداری نہیں۔!

مرزا اکبر شاہ عالم کے تخت سلطنت پر جلوس فرمانے سے صرف چار ماہ بعد، رمضان ۱۱۷۳ھ کو پیدا ہوئے تھے اور والد ماجد کو بہت عزیز تھے لیکن خلف اکبر مرزا جواں بخت تھے

اور احمد شاہ ابدالی نے اُن کو ولی عہدی کے لئے نامزد کیا تھا اسلئے اکبر کی جانشینی کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

تاہم دوسرے مرشدزادوں سے بہتر حالت میں بسر کرتے تھے اور اُن کے فرزند نے بھی شایانِ منصب ناز و نعمت سے پرورش پائی۔ ابوظفر تاریخی نام رکھا گیا اور خزانۂ شاہی سے وظیفہ مقرر ہو گیا۔

دستور تھا کہ خاندان تیموریہ کے ہر ایک نوزائیدہ بچہ کا نام رجسٹر میں درج کیا جاتا تھا اور دربار کے نجومی اُسکی جنم کنڈلی بناتے تھے مرزا ابوظفر کا زائچہ اب کہاں میسر آسکتا ہے ورنہ دیکھا جاتا کہ منجموں نے کیا موشگافیاں کی تھیں۔ مریخ وزحل کو ایک گھر میں بتایا تھا یا "عقرب میں قمر تھا قوس میں تیر"۔ ممکن ہے کہ اختر شناسوں نے پیشین گوئی کی ہو کہ یہ فرزند پیرانہ سالی میں سمندر کا سفر کریگا اور اعزہ و اقربا نے بحری سفر سے سعادت حج کی آس لگائی ہو۔ لیکن اُسوقت کون کہہ سکتا تھا کہ عبور دریائے شور جلا وطنی کا پیش خیمہ ہے اور رنگون کا قیدخانہ کعبہ کی زیارت ہے۔

بہ زمین کوئے جاناں سفر حجاز دارم

تعلیم و تربیت

مرزا ابوظفر نے ہوش سنبھالا اور آنکھیں کھولیں تو شہزادوں کی طرح اُنکی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس عہد کے مشہور قاری حافظ محمد خلیل نے قرآن پڑھایا اور اس شرف کی یادگار میں اُنکے صاحبزادے داؤد خاں ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء تک قلعہ سلطانی کے داروغۂ نذر و نیاز رہے اور ندیم الدولہ خلیفۃ الملک حافظ محمد داؤد خاں مستقیم جنگ کے القاب سے دفتر شاہی میں

یاد کئے جاتے تھے۔

اتالیقی کا منصب گرامی حافظ ابراہیم کو عطا ہوا جنکے والد حافظ محمد علی غزنوی مرزا اکبر شاہ کے اتالیق رہے تھے اور جنکے پرپوتے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ نے اقلیم ادب وتاریخ میں شہرت پائی حافظ ابراہیم کی وفات کے بعد انکے بڑے بیٹے حافظ بقاء اللہ شرف آبائی سے فیضیاب ہوئے اور ۱۸۵۷ء تک انکا خاندان قلعہ معلی کا نمکخوار تھا ہندوستان کے مشہور خوشنویس سید جلال الدین حیدر "مرصع رقم" کے والد میر ابراہیم علی شاہ نے تحریر کی مشق کرائی اور خط نسخ ونستعلیق میں شاگرد کو استاد بنا دیا۔

فارسی انشا پردازی اور عربی درسیات کی تعلیم دیگئی قادر اندازی، شہسواری، تیغ زنی سکھائی گئی نشانہ بازی اور تفنگ اندازی میں وہ درجہ کمال حاصل ہوا کہ بڑھاپے کے وقت قلعہ کے مرشد زادوں کو ان فنون کی بذات خاص تعلیم دیتے تھے۔

احسن الاخبار بمبئی مورخہ ۱۰ جولائی ۱۸۴۶ء کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ جبکہ حضور اپنی دولت سرائے واقع قطب صاحب میں رونق افروز تھے ایک دن شہزادہ شاہرخ بہادر نے عرض کی کہ یہاں ایک مقام میں ایسا موذی سانپ سنا گیا ہے کہ جس سے لوگوں کو سخت تکلیف اور نقصان جان کا اندیشہ ہے حضور نے یہ بات سنتے ہی فرمایا چلو مجھے بتاؤ وہ سانپ کہاں ہے شہزادہ نے سانپ کے بل کے پاس جاکر اشارہ کیا کہ یہاں ہے حضور نے سانپ کو دیکھ کر ایک ایسا تیر مارا کہ اسکو دم لینے کی مہلت نہ ملی اور فوراً مر گیا۔

ظہیر دہلوی راوی ہیں کہ ایک دن سواری مبارک سلیم گڈھ سے قلعہ کو آتی تھی۔ راستہ میں مرزا فتح الملک بہادر ولی عہد کا باغ تھا۔ وہاں سے کچھ شور وغل کی آواز آئی۔ فرمایا غل کیسا ہے۔ عرض کی گئی کہ مرشد زادے تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ حکم ہوا سواری لے چلو۔ وہاں پہونچے۔ سب آداب بجالائے۔ فرمایا تیر کمان ادھر لاؤ۔ کمانوں کی کشتی پیش کی گئی۔

ان میں سے ایک کمان اُٹھالی ۔ اور تین تیر کھینچ لئے ایک تیر لگایا وہ تودہ میں پیوست ہوگیا ایک بالشت باہر رہا دوسرا تیر لگایا وہ اس سے زیادہ تودہ میں داخل ہوا ۔ تیسرا بالکل ہی غرق ہوگیا فقط سوفار ہی باہر رہی نعرۂ تحسین و آفریں بلند ہوگیا یہ میری چشم دیدہ بات ہے" یہ بھی لحاظ رہے کہ اُس وقت بادشاہ کی عمر ۸۰ برس سے متجاوز تھی!

بنوٹ کے فن میں میر حامد علی کے شاگرد ہوئے جو اُس زمانہ میں اس ہنر کے بے نظیر اُستاد تھے اور علی مدد کی کثرت اُنکے گھرانے کی میراث تھی۔

چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ بادشاہ تنِ تنہا آٹھ آدمیوں کے مقابل ہوتے تھے، وہ سب اُنپر چوٹ آتے اور یہ سب کے وار رُوکتے تھے اور اپنی چوٹ چھوڑتے جاتے تھے۔ شہسواری میں وہ کمال تھا کہ ہندوستان میں "ڈھائی سوار" مشہور تھے۔ ان میں سے ایک مرزا ابوظفر تھے اور دوسرا اُنکے بھائی جہانگیر جنھوں نے انگریزوں سے شرط بدکر الہ آباد میں ایک خندق گھوڑے سے کدائی تھی۔ اسی برس کے سن میں پشت اسپ پر سوار ہوتے تو معلوم ہوتا تھا کہ گھوڑے پر ایک ستون قائم کر دیا ہے بصیرت کا یہ عالم تھا کہ گھوڑے کے عیب و صواب قدم دور سے دیکھ کر بتاتے تھے۔

بندوق ایسی لگاتے تھے کہ کبھی نشانہ خطا ہی نہ کرتا تھا۔ کبوتر بازی ۔ مرغ بازی ۔ بٹیر بازی کا شوق اس زمانہ میں دِلی اور لکھنؤ کے رئیس زادوں کیلئے ویسا ہی ضروری تھا جیسا کہ ہمارے زمانہ کے انگریزی خوانوں کے لئے کرکٹ ۔ فٹ بال ۔ بلیرڈ اور برج سے عشق !! مرزا ابوظفر کو زندگی بھر کبوتروں سے محبت رہی بہتر برس کی عمر میں کبوتروں کی اُڑان دیکھنے کے لئے تشریف لیجاتے اور "بلند نظری کی" داد دیتے تھے۔

مرغ بازی کے اصول و قواعد پر عبور اشعار ذیل سے ثابت ہے

رہے ہے پرخلش دشمن دم جنگ   نہیں یہ مرغ لڑتا کھل کے کانٹے

ابھی ہونیکا نہیں لڑنے کو تیار عدو — پھڑکے یہ مُرغ تو دو چار برس میں بھڑکے

موسم گل کی خبر سن کے قفس میں صیاد — آ کے کریال میں ہر مُرغ خوش آہنگ کھلا

مستعد ہے جنگ پر غیروں کے کہنے سے ظفر — ہے یہ مُرغ بیحیا کس چاؤ پر پانی پر چڑھا

بٹیر بازی کی شان سب سے اعلیٰ ہے ۔

ایسے شاہین ہوئے ہیں مرے تیار بٹیر — ماریں شاہیں کو اُڑا کر یہ جگر دار بٹیر

چھوڑیں لڑنے کو اگر یہ تو لڑیں مرغ سے بھی — مُرغ کو بلکہ یہ سیمرغ کو لیں مار بٹیر

چاک کرتے ہیں حریفوں کے بٹیروں کا جگر — تیز جو کرتے ہیں یہ خنجر منقار بٹیر

مجھ کو یہ عشق ہے ان سے کہ کھلاؤں اُنکو — کھائیں گر دانہ کی جا گوہر شہوار بٹیر

تیلیاں پلکیں ہوں اور چشم بنے جوں کابک — گر رہیں آنکھوں میں یہ مرغ نظر دار بٹیر

ہوئے اس کھیل میں دل صیدیوں کے بند ایسے — دام صیاد میں ہوں جیسے گرفتار بٹیر

اتفاقاً کوئی گران میں سے گھٹ بھی جاوے — بے مزہ دیں جو لڑا میرے طرفدار بٹیر

کہدو صیدی کہ تو خوش نہو کیا ہوتا ہے — ہاتھ اندھے کے اگر آ گئی اک بار بٹیر

نسر طائر بھی اُنھیں دیکھ کے کہتا ہے کاش

دیوے مجھ کو بھی بنا خالق دادار بٹیر

بیسویں صدی کے روشن خیال محو حیرت ہونگے کہ اگست ۱۸۴۶ء میں جبکہ مرزا کی عمر قمری حساب سے تہتر برس کی تھی مرشد زادہ آفاق مرزا شاہ رُخ بہادر کی زوجہ محترمہ کے قرابت دار نواب عبداللہ خاں صدالصدور کے صاحبزادے اصغر علی خاں مرزا شاہ رخ کے توسط سے حضور انور کی خدمت گرامی میں شرف اندوز مجرا ہوئے اور درخواست کی کہ ہمیں بٹیر بازی کا

فن سکھا دیا جائے شاگردی کی شیرینی پیش کی اس فن کی بعض خاص خاص باتوں سے آگاہ فرمایا پھر دونوں کو خلعت دوشالہ سے معزز و ممتاز فرمایا۔ اور بٹیروں کا ایک پنجرہ بھی عنایت کیا[1]

ہنسی کو ضبط کرو اور عبرت کے آنسو بہاؤ۔ آج جن مشاغل پر تم ناز کرتے ہو اور جن تفریحات کو تہذیب کا تمغہ، ترقی کا طغرا تصور کرتے ہو۔ سَو برس کے بعد تمہارے پوتے پر پوتے ان کا نام سنکر شرمندہ ہونگے اور تعجب کرینگے کہ اُنکے مقدس اجداد ایسے حرکات لغو کے مرتکب ہوتے اور اُنکا علی الاعلان اظہار کرتے تھے!

غرض وہ تمام علوم وفنون جو بارھویں صدی ہجری میں دار السلطنت میں رائج تھے، مرزا ابوظفر کو سکھائے گئے۔ آداب شاہی۔ بزرگوں کی تعظیم۔ چھوٹوں پر شفقت۔ دوستوں سے اخلاص۔ خدا کا خوف اور شریعت حقہ کی پابندی دل میں نقش فی الحجر کی طرح راسخ کرائی گئی۔ شاعری کی طرف ایام طفلی سے میلان خاطر تھا۔ اس فن شریف میں پہلے شاہ نصیر کے اور بعد ازاں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد ہوئے مگر اسکی تفصیل آگے چلکر بیان ہوگی۔

بیعت

حضرت مولانا فخر الدین چشتی[2] جو بیک واسطہ سرگروہ سلسلہ چشتیہ نظامیہ شاہ کلیم اللہ جہان آبادی

---

[1] احسن الاخبار مورخہ ۲۰۔ اگست ۱۸۴۶ء ۱۲

[2] تاریخ ولادت ۱۷ ربیع الاول ۱۱۲۶ھ روز پنجشنبہ اپنے والد ماجد مولانا نظام الدین اورنگ آبادی سے جو قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے رہنے والے حضرت مخدوم شیخ سعدی کاکوروی کی اولاد سے تھے مگر مرشد کے حکم سے مقیم اورنگ آباد تھے ۱۲ محرم ۱۱۴۵ھ کو خرقہ خلافت پایا اور انکے ارشاد کے مطابق ۱۱۶۰ھ سے دلی میں قیام اختیار کیا تاریخ وفات ۲۷ جمادی الثانیہ ۱۱۹۹ھ بروز شنبہ بوقت عشا۔ مزار مبارک حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خانقاہ میں ہے "خورشید دوجہانی" تاریخ وصال ہے ۱۲

کے خلیفہ تھے اُسوقت دلی میں رونق افروز تھے۔ بادشاہ۔ شہزادے اور بیشتر ارکین دربار انکے معتقد تھے۔ مرزا ابوظفر حصول فیض و برکت کے لئے اُنکی خدمت میں پیش کئے گئے اور حضرت مولانا نے شفقت و الطاف سے اُنکی پیشانی پر آثار ہوشمندی اور ستارۂ بلندی ملاحظہ فرماکر دستار بندی سے مشرف فرمایا۔ گویا کہ تاج سلطنت کی در پردہ بشارت دی حالانکہ اُسوقت کوئی اُمید نہ تھی کہ یہ طفل شاہ جہاں کے تخت اور شاہ عالم کے بخت کا وارث ہوگا۔

کیوں نہ تو سر بفلک کھینچے کہ فخرالدین نے
دی ہے دستار ترے سر پہ ظفر کھینچ کے باندھ

مولانا کے صاحبزادے غلام قطب الدین والد کے قدم بقدم تھے اپنے پیر و مرشد کی وفات سے صرف چند ماہ بعد، ۱ر محرم ۱۲۰۰ھ کو عالم بقا کی طرف راہی ہوئے اور خاندان تیموریہ کو بے یار و سرپرست چھوڑ گئے۔ دس گیارہ برس کی عمر میں مرزا ابوظفر حضرت قطب الدین کی فیض بیعت سے مشرف ہوئے اور تمام عمر اس سلسلہ کی داغ غلامی پر فخر کرتے رہے۔

مرید قطب دیں ہوں خاک پائے فخر دیں ہوں میں
اگرچہ شاہ ہوں اُنکا غلام کمتریں ہوں میں

انہیں کے فیض سے ہی نام روشن میرا عالم میں
دگرنہ یوں تو بالکل رو سیہ مثل نگیں ہوں میں

نہ کعبہ سے غرض مجھکو نہ میخانے سے کچھ مطلب
ہمیشہ گھستا اُنکے آستانے پر جبیں ہوں میں

رہوں میں رند میکش پر رہوں اُنکی محبت میں
نہیں خواہش مجھے یہ صوفی خلوت نشیں ہوں میں

مجھے تو خانقاہ و میکدہ دونوں برابر ہیں،
ولیکن یہ تمنا ہے کہ اُنکا ہوں کہیں ہوں میں

یہی عقدہ کشا میرے، یہی ہیں رہنما میرے
سمجھتا ان کو اپنا حامی دنیا و دیں ہوں میں

بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں
ولیکن اے ظفر اُنکا گدائے رہ نشیں ہوں میں

جو خاک بھی ہوں تو ہوں فخر دین کے در کی — ظفر چھڑائے نہ مجھ سے اس آستان کو چرخ

جو فخر جہاں کا ہو گدا اُس کو ظفر — بادشاہی سے زیادہ ہے گدائی میں مزا

خاک پائے فخر دیں ہے اپنے حق میں کیمیا — اے ظفر کیوں خواہش اکسیر کرنی چاہیئے

کوچۂ فخر جہاں کی اے ظفر — خاک کی چٹکی بھی بس اکسیر ہے

جو سمجھے کفش پائے فخر دیں کو تاج سر اپنا — پسند اُس کو ظفر کب افسر شاہانہ آتا ہے

جو ہاتھ آئے ظفر خاک پائے فخر الدین — تو میں رکھوں اُسے آنکھوں پہ توتیا کیلئے

اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ سے جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن اپنے فخر دیں کے کفش برداروں میں ہوں

اے ظفر دل سے ہوں میں خاکِ درِ فخر الدین
معتقد میں نہ گداؤں کا ہوں نے شاہوں کا

ظفر نہ کیونکہ ہو دل سے غلام قطب الدیں — ازل سے معتقد فخر دیں بنایا تھا

سلطنت کی حالت

غرض خاتم السلاطین قلعہ کے اندر بڑے ناز و نعمت سے پرورش پا رہے تھے۔ اور اُنکی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام و انتظام سے ہو رہی تھی۔ اب باہر کے تماشے دیکھئے کہ کسطرح سسک سسک کر سلطنت کی جان نکل رہی تھی۔

مرزا ابو ظفر کی ولادت سے سال ہی بھر بعد نجف خاں امیر الامرا نے جاٹوں کو شکست دی اور اُنکا زبردست قلعہ ڈیگ ۱۷۷۶ء میں فتح کر لیا جاٹوں کے زیر ہونے سے دہلی اور آگرہ کا درمیانی حصہ سلطنت دہلی سے مرعوب ہو گیا قلعہ اکبر آباد بھی مسخر ہوا لیکن ممالک مفتوحہ کے انتظام سے فراغت نہ ہوئی تھی کہ ضابطہ خاں مسبوق الذکر نے نیا فساد کھڑا کر دیا۔ اُس نے سکھوں کی فوج مرتب کی اور اُنکے ساتھ اسقدر میل جول بڑھایا کہ اُسکے سکھ ہو جانے کا شبہ کیا جانے لگا۔ یہ فوج قلعہ غوث گڈھ میں جمع تھی جسکے کھنڈر مظفر نگر کے ضلع میں پائے جاتے ہیں اور جس کی عظیم الشان مسجد اسوقت تک اپنے بانیوں کی عظمت پر آنسو بہا رہی ہے۔ اس فتنۂ جدید کو فرو کرنے کے لئے امیر الامرا نے خود قلعہ کا محاصرہ کیا، لڑائیوں کا سلسلہ ایک مہینہ تک قائم رہا، آخر کار ضابطہ خاں نے صلح کا پیام دیا۔ مرزا نے قصور معاف کیا اور ضابطہ خاں کی بہن سے اپنی شادی کر کے رشتۂ الفت کو مستحکم کر لیا۔ اب چند روز کے لئے ہندوستان کو امن نصیب ہوا۔ ضابطہ خاں کو سہارنپور کی فوجداری دیگئی۔ پنجاب کا جسقدر حصہ سکھوں کی حکومت سے آزاد تھا وہ مرزا نجف خاں کے افسران فوج اور احباب میں بطور جاگیر کے تقسیم ہوا۔ وزارت کے منصب سے باپ کے مرنے پر آصف الدولہ سرفراز ہوا اور اودھ کی صوبہ داری جواب دہلی کی بادشاہی سے بدرجہا افضل و اعلیٰ تھی بدستور اُسکے قبضہ میں رہی شاہ عالم کی مفلسی کا یہ حال تھا کہ ۱۷۷۹ء میں اسکی ماں لال کنور کا انتقال ہوا تو جدید مقبرہ بنوانے کے لئے سرمایہ نہ تھا۔

ہمایوں کے عہد میں کسی حرم سلطانی کے دفن کرنے کے لئے ایک عمارت بنی تھی جو ابھی تک برقرار اور "لال بنگلہ" کے نام سے موسوم ہے اس میں پرانی قبر کے پاس ایک نئی لحد کھود کر سلطان وقت کی والدہ دفن کر دی گئیں۔

المختصر ۲۶۔ اپریل ۱۷۸۲ء کو جبکہ سندھیا اور ہولکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی پہلی جنگ مرہٹہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ اور صلحنامہ "سلبائی"[1] پر دستخط ہونے کے بعد ان کو ہندوستان کی طرف متوجہ ہونیکا مکرر موقع ملا تھا مرزا نجف خاں مر گیا۔ اور سلطنت مغلیہ کا آخری وفادار ملازم دنیا سے رخصت ہوا۔

اب منصب امیر الامرائی کے دو دعوے دار ہوئے اول تو افراسیاب خاں، جو نجف خاں مرحوم کی بہن کا منہ بولا لڑکا تھا اور دوسرا مرزا شفیع جو مرحوم کا قریبی رشتہ دار تھا۔ ان دونوں میں عرصہ تک جنگ زرگری ہوتی رہی، پہلے افراسیاب کامیاب ہوا پھر شفیع بازی لیگیا آخر کار ۲۳ ستمبر ۱۷۸۳ء کو مرزا شفیع دھوکے سے قتل کیا گیا اور افراسیاب عہدہ امیر الامرائی پر قابض ہو گیا۔

شاہزادہ جواں بخت

شاہ عالم کو اپنی بیدست و پائی کا احساس تھا لیکن پانی سر سے گذر چکا تھا اور

---

[1] "سلبائی" کے صلحنامہ پر ۱۷ مارچ ۱۷۸۲ء کو فریقین کے دستخط ہوئے۔ اس صلحنامہ سے مادھوجی سندھیا کی قوت میں کوئی فرق نہیں آیا لیکن پیشوا کے دربار میں انگریزوں کو مداخلت کا حق حاصل ہو گیا۔ اس صلح اور جنگ کی تفصیل سے ہماری کتاب کو کچھ علاقہ نہیں ہے۔

کسی طرف ساحل عافیت نظر نہ آتا تھا۔

ولی عہد جواں بخت افراسیاب خاں سے بیزار، لیکن بے بس تھا اور اُسکی حرکات کی نگرانی کے لئے امیر الامرا کی طرف سے جاسوس مقرر تھے اس اثنا میں خبر ملی کہ انگریزوں کا گورنر لکھنؤ آیا ہے ولی عہد نے لکھنؤ جانے کا ارادہ کیا تاکہ اپنے باپ کی داستان بیکسی سنائے اور کمپنی سے اعانت کی درخواست کرے ۱۴۔ اپریل ۱۷۸۴ء کو رات کے وقت جبکہ آندھی چل رہی تھی اور اُسکو بخار چڑھا ہوا تھا بھیس بدل کر قلعہ کی چھتوں کو پھاند شاہ برج سے پگڑیاں لٹکا کر بھاگا اور گرتا پڑتا لکھنؤ پہونچا۔

وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل لکھنؤ میں نواب وزیر کے مہمان تھے شہزادہ شہر کے ناکہ پر پہونچا نواب وزیر اور گورنر جنرل دونوں استقبال کے لئے گئے، نذریں پیش کیں صاحب عالم ہاتھی پر سوار ہوئے، نواب وزیر نے خواصی میں بیٹھکر مورچھل ہلانے کی آبائی خدمت ادا کی۔ گورنر جنرل گھوڑے پر سوار جلو میں تھے جنرل مارٹن کی مشہور کوٹھی میں قیام ہوا۔ نواب نے تین لاکھ نقد و جنس بطور پیشکش نذر کیا ہر صبح کو دربار شاہی سمجھ کر حاضر خدمت ہوتے تھے گھڑیوں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے اور ایک ایک الائچی یا گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجرا گاہ سے آداب بجالاتے تھے سیال بھر تک بڑے شان و شکوہ سے لوازم مہمانداری ادا ہوئے لیکن گل مقصود کی بو بھی نصیب نہ ہوئی سرکار اودھ میں فوجی قوت باقی نہ تھی وہ تو شجاع الدولہ کے دم سے تھی اور اُسی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی دہلی کے معاملات میں مداخلت اپنے اُصول کے خلاف سمجھتی تھی۔ اتفاقات قضا و قدر سے شہزادہ کی آنکھ ایک خوبصورت طوائف "بگیا" نام پر پڑی۔ اور دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ نواب وزیر کو بہت ناگوار ہوا۔ کیونکہ اس کسبی کی طرف وزارت مآب کی بھی نظر تھی۔ بگیا کے آمد و رفت کی بندش کر گئی سمند عشق پر تازیانہ لگا شہزادہ رات کے وقت چھپکر کسبی کے گھر جانے لگا۔ آتش رقابت

تیز ہوئی۔ نواب وزیر نے منظور نظر کی حفاظت کے لئے پہرے متعین کر دیئے۔ ناسمجھ دل پر شہزادہ کا قابو نہ تھا۔ جب کھڑکیاں چھوپی گئیں روزن در بند ہوئے تو صاحب عالم نے گورنر جنرل کی وساطت سے "بگیا" کی درخواست کی۔ بہزار مشکل "بگیا" محل شاہی میں داخل ہوئی۔ اور اسی خوش قسمت عروس سے شاہزادہ عالی قدر پیدا ہوئے معشوق تو مل گیا لیکن نواب وزیر سے صفائی نہ رہی خیر اندیشوں نے صلاح دی کہ شہزادہ صاحب لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے بنارس میں قیام کریں۔ چنانچہ شاہزادے نے کاشی جی میں باس کیا۔ جہاں اُن کی اولاد اسوقت تک موجود ہے۔

اِدھر نیا گل کھلا کہ شہزادہ کے فرار ہونے سے سات ماہ بعد مرزا شفیع مقتول کے بھائی نے افراسیاب خاں کو ہلاک کر دیا۔ اور خود مادھوجی سندھیا کی پناہ میں چلا گیا۔ سندھیا کا اختر اقبال ترقی پر تھا۔ بادشاہ نے بھی اس سے ساز کر لینا مصلحت سمجھا۔ امیر الامرائی کا عہدہ پیشوا کو عنایت ہوا اور مادھوجی سندھیا بطور نائب امیر کے آگرہ اور دہلی کے صوبوں کا مہتمم افواج حکومت کا سپہ سالار اور سلطنت کا وکیل مطلق مقرر ہوا تھوڑے دنوں کے بعد ضابطہ خاں بھی مر گیا۔ مغلوں کے تمام قدیمی ہوا خواہ ختم ہو گئے۔ اراکین دربار سندھیا کے تابع فرمان تھے۔ بادشاہ کے ذاتی اخراجات کے لئے ۶۵ ہزار ماہوار مقرر تھا اور شاہ جہاں کا بدقسمت جانشین لال قلعہ میں ایک معزز قیدی تھا! اس وقت مرزا ابوظفر کی عمر تقریباً دس سال کی تھی مرزا جواں بخت ہنوز ولی عہد تھے سندھیا نے اُن سے پیغام سلام شروع کیا۔ اور اُنکو دلی بلانا چاہا۔ لیکن نواب اودھ اور ملازمان ایسٹ انڈیا کمپنی نے جانے نہ دیا۔ کیونکہ شہزادہ وہاں پہونچ جاتا تو دلی میں مرہٹوں کا قدم پورا جم جاتا اور یہ انگریزوں کی پالیسی کے خلاف تھا شہزادہ نے بنارس ہیں مستقل قیام اختیار کیا اور آصف الدولہ کی سرکار سے خزانۂ انگریزی کی معرفت پیش قرار نذرانہ مقرر ہو گیا۔ جسکی تعداد بروایتے پچیس ہزار ماہوار اور بروایتے پانچ لاکھ

سالانہ تھی مرہٹوں نے اُسکے جواب میں شاہ عالم کے دوسرے بیٹے ابوالنصر مرزا اکبر شاہ کو ولی عہد مقرر کیا اور دریائے جمنا سے پچھم طرف کوٹ قاسم کا پرگنہ جس کی جمع اُس وقت چالیس ہزار سالانہ تھی، اُنکی جاگیر میں دیا۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

مرزا جواں بخت بادشاہ اور ولی عہد جدید دونوں سے زیادہ آرام میں تھے۔ وہ دلی جاکر اپنی جان خطرہ میں کیوں ڈالتے۔ بنارس میں عیش کرتے اور انگریزوں کو مرہٹوں کے خلاف اُکساتے رہے۔ پہلے نواب وزیر کی معرفت گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز سے خط وکتابت رہی۔ امداد کی استدعا میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ جب وہاں شنوائی نہ ہوئی تو ۱۷۸۴ء میں ایک خط براہ راست جارج سوم شاہ انگلستان کے نام لکھوایا جسکی پیشانی پر یہ عبارت تھی:۔

"نامہ جناب معلی رکاب صاحب عالم مرزا جہاندار شاہ برائے گیتی آرائے ممالک فرنگ"

لیکن اسکا بھی کوئی نتیجہ ظاہر نہوا۔ فرنگیوں کی کمپنی مغلیہ سلطنت کو اپنا حریف سمجھتی اور اُسکی تباہی میں کوشاں تھی۔ ۸۔ مارچ ۱۷۸۵ء کو کلکتہ گزٹ میں مشتہر کیا گیا کہ "مسلمانوں کی سلطنت نہایت حقیر اور ذلیل ہوگئی ہے ہندوؤں سے ہمکو کچھ خوف نہیں ہے اگرچہ بہت آدمیوں نے یہ صلاح دی کہ مسلمانوں کو تقویت دیکر ہندوؤں کی قوت کو مغلوب کرنا چاہیئے مگر یہ تدبیر و انتظام کچھ اچھا نہیں ہے کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہم ایسے کام کریں جو ہندوستانیوں کو ناگوار خاطر ہوں اور سلطنت جو برسر زوال ہے اور وہ حقیقت میں ہماری مخفی دشمن اور رقیب ہے۔ اس کے حامی و مددگار ہوں"[1] جب انگریزوں کی امداد سے مایوسی ہوئی تو پدر عالی قدر کی زیارت کے بہانے نواب وزیر سے کچھ فوج لیکر دلی کی طرف آئے۔ آگرہ کا قلعہ مرہٹوں سے خالی کرانا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی آخر کار اپنے عیال واطفال کو لیکر بنارس چلے گئے اور وہیں چند روز کے بعد

---

[1] تاریخ ہندوستان شمس العلماء ذکاء اللہ۔ جلد نہم صفحہ ۳۳۲۔

۱۷۸۱ء میں ۲۵ شعبان ۱۲۰۱ھ کو ولی عہدی کا داغ دل میں لیکر ملک عدم کی راہ لی ؎

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

غلام قادر کا ظلم

مرزا اکبر شاہ دو تین سال سے ولی عہد سمجھے جاتے تھے اور جواں بخت کے مرنے کے بعد تو کوئی خدشہ ہی باقی نہ رہا لیکن امور جانداری میں کسی قسم کا اقتدار حاصل نہ تھا کمپنی مطلق کی فوجی طاقت بڑھی تو اعدواں سپاہی ملازم ہوئے یورپ کے باشندوں کو لشکر کی کمان ملی تیموری شہزادے ملکی معاملات سے بے تعلق ہو کر اپنا سارا وقت "خوردن و خفتن و عیش کردن" میں صرف کرنے لگے جسکا لازمی نتیجہ یعنی تباہی کا دن سامنے آیا خاندان تیموریہ کو وہ مصیبت کی گھڑی دیکھنا پڑی جو ہندوستان کی تاریخ میں خون کے حرفوں سے لکھی ہوئی ہے اور جسکو بالتفصیل بیان کرنے کی ہمارے کمزور دل میں طاقت نہیں۔

شمس العلماء منشی ذکاء اللہ نے چھاتی پر پتھر رکھ کر یہ سنگدلی کی داستان اپنی تاریخ ہند میں مفصل دوہرائی ہے۔ جسکو قصائی کی دوکان دیکھنے کا شوق ہو اس کتاب کی جلد نہم کی ورق گردانی کرے مختصر یہ کہ ضابطہ خاں کے لڑکے غلام قادر نے جو کسی زمانے میں قید ہو کر شاہ عالم کے سامنے آیا تھا اور حکم سلطانی سے زنانہ بنایا گیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد باون محال کی جاگیر پر قابض ہو کر مغلوں سے اپنی بے آبروئی کا عوض لینے کی ٹھانی۔ اور ایک موقع پر جبکہ مادھوجی سندھیا کو راجپوتوں نے زچ کر رکھا تھا۔ اور وہ دشمنوں کے استیصال کے لئے باہر گیا ہوا تھا دلی پر حملہ کردیا پہلے تو جبریہ امیر الامرائی کی سند اپنے لئے لکھوائی پھر چند روز کے بعد ضعیف العمر بادشاہ کو قید کرلیا۔ طرح طرح کی جسمانی تکلیفیں دیں۔

بیگموں کے بدن پر مار مار کے نیل ڈال دئیے، اُنکے گلابی گال مارے تھپڑوں کے لال کر دئیے
بادشاہ کے بیٹے پوتوں کو جو اس عالم میں بھی اسکے ہمراہ تھے بے تحاشہ مارنا ڈھارنا شروع
کیا اور "آخر الامر ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کو بادشاہ کو نیچے لٹا چھاتی پر چڑھ ایک آنکھ اپنے خنجر سے
نکال لی۔ دوسری آنکھ نکالنے کو اپنے ہمراہی یعقوب خاں سے کہا، اُس نے انکار کیا تو
فوراً اُسکا سر تلوار سے اُڑا دیا۔ اس خوف سے اور پٹھانوں نے دوسری آنکھ نکال لی اور
بادشاہ کو سلیم گڈھ لے چلے۔ اسوقت جو قلعہ کی کیفیت تھی قلم سے بیان نہیں ہو سکتی کوئی شہزادہ
بے بس و بیکس غم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ کوئی شہزادی سکتہ کے عالم میں بیہوش تھی۔ کوئی ہائے
شاہ عالم کہہ کر سر پیٹ رہی تھی کوئی آنکھ نہ تھی جو آنسوؤں سے پُر نہ تھی کوئی دل نہ تھا جو اس
غم سے خالی تھا"

انا للہ و انا الیہ راجعون

چنگیز خانی خون ہندیوں کی آمیزش سے پانی ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی تک تحمل و استقلال کا
اتنا جوہر باقی تھا کہ مظلوم بادشاہ کی آنکھیں نکال لی گئیں مگر اُسنے اُف نہ کی۔ خداوند ذوالجلال
کو یاد کرتا رہا اور زبان کو کلمۂ شکایت سے آلودہ ہونے نہ دیا۔

رُستم رہا زمیں پہ نہ بہرام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

مرزا ابو ظفر نے بہت عمر پائی اور انقلابات روزگار کے خوب تماشے دیکھے لیکن یہ غمناک
سین اُنکو تمام عمر فراموش نہیں ہوا۔ اور جو حسرت و عبرت اسوقت اُنکے دل میں پیدا ہوئی تھی
آخر وقت تک زبان قلم سے ظاہر ہوتی رہی۔

کسی کو پست کرے ہے فلک کسی کو بلند
کہ اس ہنڈولے میں ہے ہر زماں نشیب و فراز

تماشے گردشِ دوراں نے ہم کو خوب دکھلائے ہوا کیا کیا ہمارے انقلاب آنکھوں کے آگے ہے

نہ بزمِ غم سے غرض ہے نہ بزمِ شادی سے جہاں میں کام ہے رونے سے شمع وار مجھے

جب تلک دم ہے رہیں گے یونہی غم ساتھ کے ساتھ
دیکھنا جائیں گے غم اور یہ دم ساتھ کے ساتھ

ستم رسیدہ سلطان نے اس قیامت صغرا کے بعد اپنی بیکسی و تباہی کی تصویر ایک دردناک نظم میں کھینچی تھی جسکے اشعار یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواری ما داد بر باد سر و برگ جہانداری ما

آفتابِ فلکِ رفعت و شاہی بودم برد در شام زوال آہ سیہ کاری ما

چشم ما کندہ شد از جور فلک بہتر شد تا نہ بینیم کہ کند غیر جہانداری ما

حال ما گشتہ تبہ ہمچو اماماں ز یزید کرد تقدیر ازل روزئ ما خواری ما

بود جانکاہ زرد مال جہاں ہمچو مرض دفع از فضل الٰہی شدہ بیماری ما

شہر والوں کو پہلے تو اس حادثہ کی خبر نہ ہوئی، وہ عیش و عشرت میں مصروف رہے اور لال قلعہ میں اُس دیوان خاص کے اندر جسکی دیوار پر کندہ تھا ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

عذاب جہنم ہو تا رہا لیکن جب بادشاہ سلیم گڈھ پہونچایا گیا اور شہر میں اس عبرتناک روداد کی اطلاع ہوئی تو دارالسلطنت میں اسقدر بزدلی پیدا ہو چکی تھی کہ کسی شخص کو روہیلوں سے عوض لینے کی

ہمت نہوئی۔ بلکہ باشندوں نے گھر چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا۔ چار روز کے بعد مرہٹوں کا لشکر پہنچا اور اُنھوں نے روہیلوں کا قتل عام شروع کیا۔ غلام قادر بھاگ کر میرٹھ کے قلعہ میں چلا گیا۔ مرہٹوں نے تعاقب کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ دن بھر لڑائی رہی مگر رات کے وقت ۲۱ دسمبر ۱۷۸۸ء کو غلام قادر نے مقابلہ کی طاقت نہ دیکھ کر جمنا پار سکھوں کے علاقہ میں بھاگنے کا ارادہ کیا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور وہ سب جواہرات بیش بہا ساتھ لئے جو قلعہ کی لُوٹ سے اُسکے ہاتھ آئے تھے۔ جاڑے کی رات میں بارہ میل کا سفر کیا۔ صبح کو کُہر پڑ رہی تھی۔ گھوڑا ایک کنوئیں کے پاس گر پڑا اور چاہ کن راچاہ در پیش کا مضمون سامنے آیا۔ گھوڑا تو اُٹھ کھڑا ہوا مگر سوار مجروح ہو گیا تھا حرکت نہ کر سکا۔ جب دھوپ نکلی تو ایک برہمن نے جو بیلوں کی جوڑی لیکر کنوئیں پر پر چلانے آیا تھا اس خوش پوشاک زخمی کو دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ اپنے گھر لے گیا اور مرہٹوں کے سپہ سالار کو خبر کر دی۔ اُسنے یہ سُنتے ہی آدمی دوڑائے جو غلام قادر کو گرفتار کر کے لیگئے۔ اور سیندھیا کے پاس جو اُسوقت متھرا میں مقیم تھا پہونچا دیا۔ سیندھیا نے اُسکو بڑا ذلیل و خوار کیا۔ اوّل گدھے پر سوار کرا کے چارسو تشہیر کرایا۔ پھر اُسکی زبان کاٹ لی پھر آنکھیں پھوڑ ڈالیں، پھر ناک۔ کان۔ ہاتھ۔ پیر کاٹ لئے۔ اور جسم کا بقیہ حصہ بادشاہ کی خدمت میں دلی بھیجا۔ راستہ میں جان نکل گئی۔ اور نعش قیمہ قیمہ اندھے بادشاہ کے روبرو دیوان خاص میں پیش ہوئی کسی دل جلے نے تاریخ لکھی ہے۔

این ندا از سما رسید یکبار	کور چوں کرد شاہ را قادر
ببر و بر فگن سر بازار	سر و پائے غلام قادر را

غ = ۱۰۰۰ + ر = ۲۰۰ + ب = ۲ — ۱۲۰۲ھ

قادر کی قبر کا نشان نہیں۔ پُرانی دلی میں قطب صاحب کے مجاور ایک تربت کو قادر کیطرف منسوب کرتے ہیں لیکن یہ روایت غلط ہے۔ وہ لحد ضابطہ خاں کی ہے۔ قادر جیسے بے رحم و

سفاک کو حضرت قطب صاحب کا جوار رحمت کیونکر میسر آسکتا تھا۔ قصّہ مختصر مرہٹوں نے بادشاہ کو دوبارہ آبائی تخت پر بٹھایا۔[لہ] نو لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ امور سلطنت وکیل مطلق نے اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اسلئے سلطان کو آنکھوں کی چنداں ضرورت بھی نہ رہی،

لہ مندرجہ ذیل دیہات اور مدات کی آمدنی بادشاہ کے مصارف کیلئے نامزد تھی۔

دیہات	جمع مشخصہ	دیہات	جمع مشخصہ
بالپت (دوآبہ)	۱،۷۲،۴۲۵	حسرہ (دوآبہ)	۷۲،۰۶۴
بارن (دوآبہ)	۱،۰۴۸۹۵	کرادھوال (دوآبہ)	۳۲،۷۰۰
پھوٹ اور سیادہ	۱،۷۵،۳۳۵	نجیب نگر (آنروی جمنا)	۱،۱۰،۷۶۰
پروچیتگر	۷۷۲۰۰	دیتانی	۴۰۰۰
سونی جلال آباد (دوآبہ)	۱،۹۰،۲۰۱	کیور	۲۰۰۰۰
حویلی پالم (قصبہ دہلی)	۱،۸۹،۵۳۳	محاصل دارالضرب	۲۶۰۰۰
راہولی گوجر (دوآبہ)	۱،۰۸،۸۹۶	محاصل کروڑگیری	۱،۲۵،۶۰۱
سرداکھر کھنڈہ (")	۶۴،۴۳۲	کرایہ دوکانات دہلی	۱۷،۰۰۰
سکندر آباد (")	۷۵،۶۲۵	محاصل محالات شہر	۴۰،۰۰۰
تسکارپور (آنروی جمنا)	۲۵،۳۰۰	چنگی برآمد	۱،۵۰۰
		متفرق مکانات دہلی	۴،۹۰۰

یہ فہرست اُس عہدنامہ کیساتھ منسلک تھی جو دولت راؤ سیندھیا اور سرکار کمپنی بہادر کے درمیان ۳۰ دسمبر ۱۸۰۳ء کو ہوا تھا۔ اور ابھی تک گورنمنٹ ہند کے دفتر خارجہ میں محفوظ ہے۔

مرہٹوں اور انگریزوں کی وظیفہ خواری

سیندھیا نے بادشاہ کے اختیارات سلب کر لئے لیکن کلمۂ انصاف یہ ہے کہ مراتب شاہی کی توقیر برقرار رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مرہٹے کرتے تو اپنے جی کی تھے لیکن سب احکام بادشاہ کے نام سے جاری ہوتے تھے۔ سکہ تمام ریاستوں میں بادشاہی کا رائج تھا اور بعض رئیس ابھی تک سالانہ نذر و نیاز اور پیش کش وغیرہ حضور سلطانی میں ارسال کرتے تھے۔

اقبال مند مادھوجی ۱۲۔ فروری ۱۷۹۴ء کو اپنا کام ناتمام چھوڑ کر دنیا سے راہی ہوا۔ اور اُسکے بھائی کا عیش پسند پوتا دولت راؤ مسند نشین ریاست اور جانشین منصب وکالت ہوا۔ شاہی رعب وداب بدستور رہا ہر ایک ضروری فرمان پر شاہ عالم بادشاہ غازی کی مہر ثبت ہوتی تھی۔ اور ملک کا نظم ونسق بادشاہ کے نام سے تھا۔ فلک کجرفتار کو مغلوں کی اتنی عزت بھی ناگوار ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مرہٹوں سے پھر جنگ چھیڑی۔ سندھیا کے یوروپین افسروں نے انگریزوں سے سازش کی۔ شمالی ہند کے تمام مستحکم قلعے کمپنی کے قبضہ میں آ گئے۔ جمنا کے بائیں کنارے پر ہمایوں کے مقبرے سے قریب لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست فاش دی۔ ۱۴ ستمبر ۱۸۰۳ء کو جنرل اکٹرلونی نے دلی کے قدیم شہنشاہی شہر پر مالی اور فوجی عمل دخل کر لیا اور شاہ عالم مرہٹوں کی قید سے نکل کر انگریزوں کی حفاظت میں آیا۔

تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ

کمپنی کا کوئی حریف مقابل ہندوستان میں باقی نہ تھا۔ اسلئے سلطنت مغلیہ کا نام قائم رکھنے اور ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنے کی ضرورت نہ تھی۔ بادشاہی عملہ موقوف ہوا۔ احکام سلطانی برطرف خلق خدا کی۔ ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا!!! اندھا بادشاہ مرفوع القلم۔ اور پرورش کے لئے وظیفہ حسب تفصیل ذیل مقرر:-

حضور پُر نور	۶۰،۰۰۰
ولی عہد	۱۰،۰۰۰
جاگیر ولی عہد	۳۰۰۰
دیگر شہزادگان و شہزادیاں	۱۰،۰۰۰
مرزا ایزد بخش صاحبزادہ (معہ جاگیر)	۳۰۰۰
شاہ نواز خاں خزانچی	۲۵۰۰
سید رضا خاں ایجنٹ گورنمنٹ	۱۰۰۰
میزان کل	۸۸،۵۰۰

مرہٹے سپاہی تھے۔ اُنکے وقت میں جاگیر سے آمدنی ہوئی تو بادشاہ کا وظیفہ آیا ورنہ کئی کئی مہینہ ندارد۔ غیر معمولی فوجی مصارف پڑ گئے۔ شاہی پیشکش سوخت۔ لیکن کمپنی کے عہد میں سوداگروں سے معاملت تھی۔ بادشاہ کا نذرانہ ماہ بماہ قلعہ معلی میں پہونچتا تھا۔ اور محرم، عیدین نوروز اور دوسرے تیوہاروں کے اخراجات کے لئے دس ہزار سالانہ علاوہ رقم معینہ کے پیش کیا جاتا تھا۔

لارڈ ولزلی گورنر جنرل ہند نے ۲؍ جون ۱۸۰۵ء کو ایک طویل عرضداشت شاہ دہلی کی بابتہ کورٹ آف ڈائرکٹرس کی خدمت میں لندن روانہ کی تھی۔ اُس کے چند فقرے عبرت ناظرین کے لئے درج کئے جاتے ہیں:۔

"اس گورنمنٹ کی ہرگز یہ خواہش نہیں ہے کہ بادشاہ دہلی کو حریفوں سے محفوظ رکھنے اور پنشن دینے کے عوض میں شاہی اختیارات حاصل کرلے اور اُنکے وسیلہ سے ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں پر حکومت جتائے یا شہنشاہ موصوف کو اُن صوبہ جات پر جو وسیع سلطنت مغلیہ

میں شامل تھے یا ہیں بطور شہنشاہ ہند کے کوئی حق جتانے یا رسموں سے تعظیم فدویانہ کرانے سے باز رکھے۔

....

....

گورنر جنرل اُن مصائب کو نہ دیکھ سکے جو فرانسیسیوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں سے شہنشاہ اور خاندان تیموریہ پر پڑ گئی تھیں۔ وہ مفلسی اور شکستہ حالی میں مبتلا ہیں خاصکر معمر شہنشاہ کی حالت سقیم چشم انسان سے نہیں دیکھی جا سکتی۔

لہٰذا دریائے جمنا کے کنارے کے قطعات زمین جسقدر گرد و نواح دہلی میں شامل ہو سکتے ہیں خاندان شاہی کی پرورش کیلئے دئے جائیں۔ وہ آراضی رزیڈنٹ کے چارج میں رہے لیکن حضور کے نام سے آمدنی جمع کیجائے اور انصاف اُن قواعد اور ہدایات کے بموجب کیا جائے جو سرکار انگریزی منظور کرے۔

حضور کو ایک دیوان اور چند اہلکار مقرر کرنے کی اجازت دیجائے۔ عدالت ہائے انصاف دہلی اور اسکے متعلقات کے لئے شرع محمدی کے مطابق قائم ہوں۔ عدالت فوجداری کا حکم جو طویل قید یا سزائے موت، کا ہو بغیر حضور کی مرضی کے عمل میں نہ لایا جائے۔"

یہ اعانت کے وعدے، ہمدردی کے اقرار کیونکر پورے ہوئے آیندہ صفحات سے ظاہر ہوگا ؎

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے

جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

لیکن اسمیں کلام نہیں کہ ہمارے ممدوح کے والد مرزا اکبر شاہ کی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر ہو گئی۔ مرہٹوں کے وقت میں کوٹ قاسم کی جاگیر سے صرف تین سوا تین ہزار ماہوار کی آمدنی تھی اور وہ بھی غیر مستقل، اب دس ہزار ماہوار انگریزی خزانہ سے ملنے لگے اور جاگیر کی آمدنی

رقم بالائی۔ ولی عہد کے بیٹے پوتوں کو بھی نسبتاً زیادہ عیش میسر ہوا اور مرزا ابوظفر نے اپنی زندگی کے چند سال بڑی بےفکری سے بسر کئے اسی زمانہ کی دلچسپ تفریحوں کا ایک مرقع یہ ہے۔

تو جو مہتابی پہ کل رات کھڑا گاتا تھا
دائرہ مہ بھی لئے ساتھ سے گئے جاتا تھا

بندھ گئی تھی ہوا گانے کی وہ تیرے کہ مرا
ساتھ ہر تان کے جی تھا کہ اُڑا جاتا تھا

کیا کہوں رقص کا عالم عجب انداز کیساتھ
ساتھ ٹھوکر کے تری ٹھوکریں دل کھاتا تھا

ہاتھ کو ہاتھ پہ تو رکھ کے لگا جب چلنے
ہاتھ ہم ملتے تھے دل تھا کہ ملا جاتا تھا

دامن اپنا تو اُٹھا چلتا تھا اس ناز کیساتھ
گھیرا دامن کا مجھے گھیر کے لے آتا تھا

آنکھ چاہت کی ظفر کوئی بھلا چھپتی ہے
اس سے شرماتے تھے ہم ہمسے وہ شرماتا تھا

یہ ساغر بھی اسی دور کی عکسی تصویر ہے:۔

جام ہے شیشہ ہے ساقی بھی ہے برسات بھی ہے
ان دنوں بادہ کشی دن بھی ہے اور رات بھی ہے

کچھ تو ہے اپنی طرف سے طلب ساغرِ مے
اور ساقی کی کچھ امداد و مدارات بھی ہے

شیشہ خالی ہو تو خم پاس دھرا ہے لبریز
خم جو خالی ہو تو نزدیک خرابات بھی ہے

جوشِ مستی بھی ہے ہنگام ہم آغوشی بھی
خواہش وصل بھی ہے جائے ملاقات بھی ہے

سازِ مطرب بھی ہے اور نغمہ بھی ہے رقص بھی ہے
ساتھ ہر تار کے آنکھوں سے اشارات بھی ہے

وہ بھی سرمست ہے اور ہم بھی نشہ میں سرشار
ہاتھ گردن میں ہے اور لطف و عنایات بھی ہے

یار ہے یار کے ہے ساتھ ظفر بوس و کنار،
اور اگر چاہیے کچھ بات تو وہ بات بھی ہے

یہ فخر بھی اسی عہد کا ہے:۔

عمر کرتا ہوں بسر اپنی پریرویوں کے بیچ
ہوں وہ انسان کہ رہتا ہوں پرستان کے بیچ

وفات شاہ عالم

۷۔ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۰۔ نومبر ۱۸۰۶ء کو شاہ عالم ثانی نے انتقال کیا۔ اپنے مورث اعلیٰ شاہ عالم اول کے قریب اُسی کی بناکردہ موتی مسجد واقع قطب صاحب میں دفن ہوئے اور قلعہ کی دُنیا بدلگئی۔

تاریخ وفات از میر نظام الدین فخر الشعرا

شور بس روئے زمیں سے یہ اُٹھا
ہے کسوفِ آفتابِ سلطنت

اکبر ثانی کی تخت نشینی اور ولی عہدی کا قضیہ

ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی اپنے والد کی وفات کے بعد رمضان ۱۲۲۱ھ میں مسند نشین وظیفہ خواری ہوئے۔ ہوا خواہوں نے "جہیز عشرت پرویز" سال جلوس قرار دیا۔ لیکن قسمت کی نارسائی کو صیاد کیا کرے۔ ایک آنچ کی کسر رہ گئی!

ببر چو کرد لباس خلافت اکبر شاہ (صہبائی) بشرف دولت و اقبال و عزّ مانوس
سروش غیب ز روئے بدیہ یک ناگاہ "جہیز عشرتِ پرویز" گفت سالِ جلوس

۱ ۔ ۱۲۲۰ + = ۱۲۲۱

سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے نذر پیش ہوئی۔ سلامی کی توپیں چلیں جشن تخت نشینی دھوم دھام سے ہوا اور نابینا شاہ عالم کا اندوختہ سرمایہ بیدریغ لٹایا گیا۔ اراکین کو انعام

مستحقین کو خیرات تقسیم ہوئی۔ لیکن کوٹ قاسم کی جاگیر جو مرہٹوں کے وقت سے وارث تاج و تخت کے مصارف کے لئے نامزد تھی املاک شاہی میں شامل ہوئی اور خلف اکبر مرزا ابوظفر کو یہ خلعت عطا ہوا کہ اُسکی ولیعہدی معرضِ خطر میں آگئی۔ نواب ممتاز محل جو بادشاہ کی سب بیگموں سے صورت وسیرت میں ممتاز تھیں اپنے بیٹے مرزا جہانگیر کو منصب ولیعہدی سے ممتاز کرانا چاہتی تھیں اور بیگم کے اثر سے ہندوستان کے اُس قدیم مہاراجہ کی طرح جنے بیوی کی خاطر سے اپنے قابل ترین بیٹے کو چودہ برس کیلئے بن باس کا حکم دیکر چھوٹے لڑکے کو وراثت کا مستحق قرار دیا تھا اکبر ثانی نے بھی جہانگیر کو ظفر پر ترجیح دینے کی کوشش کی۔ انگریزوں نے اس ناانصافی سے بادشاہ کو باز رکھنا چاہا تو جہاں پناہ نے بے تکلف کہدیا کہ "ابوظفر میرا بیٹا ہی نہیں ہے"۔

مسٹر آرچبولڈ اسٹین کمپنی کیطرف سے دلی کے رزیڈنٹ تھے۔ وہ اپنی شرافت سے خاندان شاہی کی تعظیم و تکریم کرتے۔ بادشاہ کے دربار میں معمولی امیروں کی طرح تسلیم و کورنش بجالاتے اور مرزا ابوظفر کی بہت عزت کرتے تھے۔ اُنھوں نے مظلوم شہزادے کو تسلی و تشفی دی اور اُنکے حقوق کی حفاظت کا وعدہ کیا۔

ظفر سخنوروں کی پُرلطف صحبت میں اپنا دل بہلاتے اور غم ٹالتے تھے۔ فکر شعر میں محو ہو کر افکار دنیوی کو فراموش کرتے۔ اور رات کا کچھ حصہ عبادت و ریاضت میں صرف کرتے تھے مجالس حال و قال میں شریک ہوتے۔ اذکار و اشغال چشتیہ سے صفائی قلب حاصل کرنیکی کوشش میں مصروف رہتے تھے سلطنت ظاہر نصیب ہونے کی امید کم تھی حکومت باطن کی جستجو میں سرگرم تھے کہ یکایک اکبر کے منظور نظر فرزند مرزا جہانگیر کی آوارہ مزاجی اور خودسری رنگ لائی یا کسی مظلوم کی آہ نیم شبی نے تاثیر دکھائی۔ ایک سنگین جُرم میں ماخوذ ہوئے، عدالت سے سزائے قید کا حکم صادر ہوتا لیکن بادشاہ کی خاطر سے رزیڈنٹ نے عاملانہ

اختیارات صرف کئے اور چشم نمائی کیلئے الہ آباد میں نظر بند کر دیا۔

کیسی تدبیر ظفر جب وہ کرے اپنا کرم
کام بگڑے ہوئے بنجائیں یونہیں آپ سے آپ

مرزا جہانگیر لکھنؤ میں

الہ آباد جانے سے قبل شہزادہ صاحب لکھنؤ تشریف لائے۔ نواب وزیر کے دار الحکومت میں ولیعہد دہلی کے آنے کی خبر گرم ہوئی۔ شہر کے حکام معہ رزیڈنٹ کے استقبال کو نکلے۔ شہر خوب سجایا گیا۔ کوچہ و بازار تماشائیوں سے بھر گئے۔ نواب وزیر نے ایکسو ایک اشرفی نذر گزرانی۔ سلامی کی توپیں چلیں۔ شہر میں ایثار زر کرتے ہوئے داخل کوٹھی فرح بخش ہوئے۔ شاہزادہ کا لباس انگریزی تھا۔ سر پر کالی ٹوپی۔ ترکمانی ولایتی تلوار زیب کمر۔ بڑا پیچوانی حقہ ہاتھی کے ماتھے پر تھا۔ بعد چائے پانی کے کشتیاں نذر کی پیش ہوئیں۔ چار گھوڑے کی گاڑی پر سوار ہو کر پسند باغ میں داخل ہوئے۔

دوسرے دن نواب وزیر معہ رزیڈنٹ اور مرشدزادوں کے حاضر ہوئے۔ چائے پانی کے بعد سب کی نذریں علی قدر مراتب گذریں۔ نواب وزیر کو ہفت پارچہ خلعت عطا ہوا۔ ہر پارچہ پر نذر دیکر آداب بجالاتے تھے۔ رزیڈنٹ کیلئے صرف دوشالہ اور رومال کا حکم ہوا تھا۔ مگر نواب وزیر کی فرمایش سے پانچ پارچہ کا خلعت عطا ہوا۔ رزیڈنٹ نے ناواقفیت سے چاہا کہ ہر پارچہ خلعت پر آداب گاہ سے مجرا بجالائے مگر خواص شاہی نے کہا کہ یہ منصب صرف وزیر اعظم کا ہے۔ رزیڈنٹ بہت منفعل ہوئے اور افسوس کیا کہ اس جلسہ میں ناحق تشریف لائے۔ غرض نواب وزیر نے کوئی دقیقہ مراسم مہمانداری کا فروگذاشت نہیں ہونے دیا اور

تمنائے دلی تھی کہ صاحب عالم کی خدمت اسطرح کیجائے کہ بادشاہ دہلی کی خوشنودی مزاج کا باعث ہو اور کدورت ہائے ماضیہ رفع ہوجائیں لیکن شہزادہ کے عادات واطوار ایسے بگڑے ہوئے تھے کہ زیادہ عرصہ تک صفائی قائم رہنا محال تھا۔ اشرف علیخاں نام ایک شخص ستار خوب بجاتا تھا اُسے اپنا وزیر اعظم کیا اور وہ فرمانروائے اودھ سے ہمسری کا دعویدار ہوا۔ روزانہ صبح کو شہزادہ بلند اقبال گھوڑے پر چڑھتے اور شہر کے گلی کوچوں میں بے تحاشا گھوڑا دوڑاتے تھے ایک دن خاص نخاس میں گھوڑا پھیرنے لگے۔ کئی بچے کچل گئے لیکن آپ کے دل مبارک پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ارباب نشاط کے طائفے روز و شب موجود رہتے تھے اور شہزادہ کا بیشتر وقت عیش و عشرت میں گذرتا تھا۔ تقدیر کا کھیل! ایک طوائف "داڑھی" نام سے جو ناچ میں بے نظیر تھی آنکھ لڑی۔ دل ملا۔ اور وہ حرم شاہی میں داخل ہوگئی۔ نواب وزیر کو رنج ہوا۔ رزیڈنٹ کے پاس پیام بھیجا کہ اطوار شہزادے کے خراب ہیں۔ رزیڈنٹ پہلے سے خار کھائے تھا۔ اُسنے قطعی حکم دیا کہ شہزادہ فوراً لکھنؤ سے رخصت ہوجائے۔ چنانچہ اُسی روز پردۂ شب میں الہ آباد چلے گئے اور خسرو باغ میں مقیم ہوئے۔

پھولوں کا چھپرکھٹ

نواب ممتاز محل بیٹے کے فراق سے نیمجان تھیں اور شہزادے کے واپس بلانے کیلئے کوششیں ہورہی تھیں۔ نازبردار ماں نے منت مانی کہ لڑکا چھٹکر آئے تو خواجہ بختیار کاکی رح کے مزار پر پھولوں کا چھپرکھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی شفیق باپ نے انگریزوں کی خاطر مدارات کی شہزادے کا تصور معاف ہوا اور ماں باپ کی آنکھوں میں نور آیا۔ قلعہ میں رت جگے ہوئے

خیر خیرات کی دھوم مچی اور منّت پوری کرنے کیلئے قطب صاحب کے مزار پر غلاف اور پھولوں کا چھپر کھٹ چڑھایا گیا۔ پھول والوں نے اپنی ایجاد سے چھپر کھٹ میں ایک پنکھا بھی پھولوں کا بنا کر لٹکا دیا۔ اُسوقت دلی میں وہابیوں اور بدعتیوں کے اکھاڑے جمے ہوئے تھے۔ شاہ سید احمد بریلوی اور مولوی اسماعیل شہید جنھوں نے بعد کو سکھوں پر جہاد کیا اور شکست[1] پائی۔ اصلاح رسوم و اخلاق کی کوشش کر رہے تھے۔ قبر پرستی کو منع کرتے اور میلوں ٹھیلوں کی شرکت پر شرک کے فتوے صادر کرتے تھے۔

پنکھے اور چھپر کھٹ کی سخت مخالفت ہوئی۔ دنیا کے قدیم دستور کے مطابق جسقدر زیادہ مخالفت پر اصرار کیا گیا اتنا ہی زیادہ جوش کو استقلال ہوا۔ ہر عیب کہ سلطاں بہ پسند د ہنر است۔

پنکھا ایسا مقبول ہوا کہ آج سو برس کے بعد بھی جبکہ اکبر ہیں نہ جہانگیر نہ اُنکی سلطنت اور دلی عہدی پھول والوں کی سیر سال کے سال ہوتی ہے۔ برسات کا زمانہ، ساون بھادوں کا موسم بدھ سے جمعہ تک قطب صاحب میں ہنگامہ رہتا ہے۔ پنکھے چڑھائے جاتے ہیں عین میلے کا دن جمعرات ہے اُس روز ساری دلی مہرولی میں کھنچ آتی ہے۔

نہ پوچھو اہل محشر ہمسے دیوانوں کی بیتابی،
یہاں مجمع سنایاں بھی تلاش یار میں آئے

مرزا ابو ظفر صوفی مشرب تھے اور کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھتے تھے۔ ایک مخمس "پنکھے" کے فضائل پر لکھدیا۔

نہیں مستوجب تعظیم و زیارت پنکھا — جو کہیں اہل شریعت کہ ہے بدعت پنکھا
اک تماشا ہے اسے کہتی ہے خلقت پنکھا — رکھتی ہے گرمیٔ ہنگامۂ عشرت پنکھا
آتش شوق کو ہے موجب شدت پنکھا

[1] تاریخ شہادت ۲۴۔ ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۶ھ

نورِ الطاف و کرم کی ہی یہ سب اسکی جھلک
کہ وہ ظاہر ہے تلک[1] اور ہی باطن میں تلک
اس تماشہ کی نہ کیوں دھوم ہو افلاک تلک
آفتابی سے خجل جسکی ہے خورشید فلک
یہ بنا اس شہ اکبر کی بدولت پنکھا

شائق اس سیر کے سب آج ہیں با دیدۂ دل
واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشم انجم ہو نہ اس سیر پہ کیونکر مائل
سیر یہ دیکھتی ہے بیگم والا منزل
جسکے ایواں کا رکھے ماہ سے نسبت پنکھا

(بیگم سے ممتاز محل کی طرف اشارہ ہے جنکا اسوقت طوطی بول رہا تھا۔ اور جو مرزا ابوظفر کو منصب ولی عہدی سے معزول کراکے اپنے نور بصر کو وارثِ سلطنت بنانا چاہتی تھی)

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زبس ماہ تلک
ڈوبے ہے رنگ میں مدہوش سے آگاہ تلک
آج رنگیں ہیں رعیت سے لگا شاہ تلک
زعفراں زار ہے اک باغ سے درگاہ تلک
دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پنکھا

عشرت و عیش کا ہے باغ میں انبوہ عجب
عرق شبنم گل ٹپکے ہے گرمی کے سبب
بے طلب غنچہ نہیں ناز سے کھولے ہوئے لب
شاہدانِ چمن اسدم ہیں جو سرگرم طلب
دامن باد سے چاہیں ہیں بہ منت پنکھا

حرکتیں دیکھ کے پنکھے کی کہیں اہل خرد
کہ وہ ہے غم کی طرف مار رہا دست مرد
لیک میں نے اس اشارہ سے یہ پایا مقصد
ہے تماشائیوں کو اپنے بلاتا شاید
دستِ جنباں کی جو رکھتا ہے شباہت پنکھا

---

[1] تلک سے مقصود اکبر شاہی ہے ۱۲

مرد و زن شاہ و گدا کودک و پیر و برنا | جو ہوا خواہ ہیں پنکھے کے وہ سب ہیں یکجا
ہر طرف شور سا ہے اور یہی ہے غوغا | کی ہے ہنگامۂ عشرت نے قیامت برپا

ایک نیزے پہ ہے خورشیدِ قیامت پنکھا

(مرزا جہانگیر کی الہ آباد سے واپسی ظفر کی ولیعہدی کے لئے فتنۂ محشر سے کم نہ تھی۔
پنکھا ضرور خورشید قیامت ہونا چاہیئے !!)

سیرِ وحدت ہے اگر دیکھئے پنکھے کا جلوس | یعنی اک رنگ ہیں سب باعثِ رنگیں ملبوس
کیوں نہ پنکھے سے دل طاعتیاں ہو مانوس | اُلٹا لٹکا ہے یہ پڑھنے کو نمازِ معکوس

کوئی عابد ہے بڑا اہلِ ریاضت پنکھا

دل گرفتوں کی یہاں کیوں نہو تفریحِ مزاج | یہ تماشا مرضِ غم کا مجرب ہے علاج
ہر طرف عیش کا سامان ہے عشرت کا رواج | لائے ظفر خاطرِ یاران کے ہوا خواہ کو آج

فرحت افزا ہے دمِ گرمیٔ صحبت پنکھا

(سبحان اللہ! دل کا راز الفاظ کے ساز سے ہم آواز ہے!!)

شادی اور موت

منتوں سے فراغت ہوئی تو ماں نے اپنے گلعذار کے سہرے کی بہار دیکھی دھوم دھام سے مرزا جہانگیر کی شادی رچی۔

ہجوم عیش و طرب اسقدر زمیں پہ ہُوا | دبیرِ چرخ سے بھی ہو سکا نہ اسکا شمار
لعبتانِ فلک پر ہوا خوشی کا جوش | سُہاگ گانے لگی زہرہ بنکے موسقیار
شبِ برات کی وہ روشنی کہ صلِّ علیٰ | ہو روزِ عید اگر آئے سامنے شبِ تار

شیخ ابراہیم ذوقؔ جنکی رسائی دربار شاہی میں ظفر کے طفیل میں ہو چکی تھی اور ایک قصیدہ

کے صلہ میں "ملک الشعراء خاقانی ہند" کا خطاب پا چکے تھے۔

مدح حاضر کیلئے حاضر دربار ہو ذوقؔ
تو ہی خاقانی ہند اور وہ ہی خاقان زماں،

تہنیت کے پھول لیکر حاضر ہوئے۔

شہا! ہے آج اسی شاہزادہ کی شادی ۔۔۔ جہاں میں جو ہے جہانگیر شاہ نیک اطوار
وہ شاہزادہ ہے پر ہے ابھی سے شاہ نشاں ۔۔۔ وہ شاہزادہ جواں ہے دلے کہن کردار
کہو سر لب بستہ سے شادی فرزند ۔۔۔ مبارک آپ کو ہو اے شہ سپہر وقار

ل = ۳۰ + ب = ۲ ۔۔۔ ۱۲۳۵ = ۱۱۹۳

شہا! خدا سے یہی ہے مری دعا ہر بار ۔۔۔ کہ شادیاں ہوں شبستاں میں تیرے لیل و نہار

جہانگیر شاہ کی "نیک اطواری" الہ آباد کی نظر بندی سے ظاہر ہے۔ اور "کہن کرداری" کا ثبوت بہت جلد آنکھوں کے آگے آتا ہے۔ البتہ ذوقؔ کی یہ دعا ضرور قبول ہوئی کہ بادشاہ کے "شبستان" میں "لیل و نہار" شادیاں ہونے لگیں۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دوسرے شہزادے مرزا سلیم کا بیاہ رچا۔ یہ بھی دوسرے نمبر پر ولیعہدی کے امیدوار تھے۔ اور مرزا جہانگیر کی "نیک اطواری" الم نشرح ہونے کے بعد انکے لئے بھی وارث تاج و تخت قرار دئے جانیکی کوشش ہو رہی تھی! استاد ذوقؔ کے "افق دل پر" پھر "عیش و طرب" کا ہجوم ہوا اور دُرِ شہوار اسطرح نچھاور ہونے لگے!!

آج اس شاہ کے فرزند کی ہے شادی کہ جو ۔۔۔ کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم
کون وہ؟ ظلِ خدا۔ شاہ محمد اکبر ۔۔۔ جس کی ہمت سے ہوں دریوزہ گر ارباب ہمم
شاہ کا پوچھو جو فرزند تو شہزادہ سلیم ۔۔۔ ہو سلامت رہے اس کی یہ سلامت منضم
رقعہ شادی کا ہے اس رنگ سے تحریر ہوا ۔۔۔ کہ جوانانِ چمن آئیں جو مل کر باہم

شاخ گل پہنے کلائی میں کلی کا کنگنا
زرد جوڑے پہ بسنت اپنا دکھائے عالم

عطرداں میں گل نرگس وہ بھرے عطر سہاگ
سارے گل بھرنے لگیں بلبل بیتاب کا دم

لوگے جب ساز خدا ساز کو آغوش میں آج
تار چھیڑ دگے کھرج کا تو سنوگے پنچم

اثر نغمۂ شیریں سے جہاں بھول گیا
کہ سوار آگ کے سم کے ہے کوئی اور بھی سم

بیاہ کی شب وہ تجلی تھا کہ اللہ اللہ
کہتا تھا دیدۂ انجم سے یہ گردوں ہر دم

سچ کہو کرتے ہو نظارہ جہاں کا جب سے
کبھی یہ جلوہ ہے دیکھا تمھیں آنکھوں کی قسم

منہ پہ نوشاہ کے یوں سہرۂ زرتار کی زیب
رُخ خورشید پہ جوں خط شعاعی کی جھلم

رونمائی پہ لگی رشک سے زہرہ گانے
غیرت از چشم کنم روئے تو دیدن نہ دہم

ظفر کے دیوان سوم میں ایک سہرا ہے جو انھیں دونوں کی شادیوں میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ سہرا شاہ کے نور بصر کا ہے سہرا
یہ سہرا شاہ کے جان و جگر کا ہے سہرا

عجب طرح کی شیان و شکوہ کا ہے بیاہ
عجیب طرح کی یہ کر و فر کا ہے سہرا

نہ ہے نشاط نہ ہے خرمی کہ دیکھنا آج
ہوا نصیب پدر کو پسر کا ہے سہرا

چڑھا طرب کا جو دریا تو آیا کشتی میں
یہ نور چشم شہ دادگر کا ہے سہرا

جو لعل ہیں گل احمر تو موتیا موتی
یہ سہرا پھولوں کا لعل و گہر کا ہے سہرا

جواب حسن مہ مصر کا ہے نور جمال
حجاب چہرۂ شمس و قمر کا ہے سہرا

وہ تیرا چاند سا مکھڑا کہ جس پہ ماہ لقا
بندھا ستاروں کے تار نظر کا ہے سہرا

شادیوں کی دھوم دھام تھی۔ ولیعہدی کا منصب کبھی مرزا جہانگیر کو عنایت ہوتا اور کبھی شہزادہ سلیم کے لئے ودیعت رکھا جاتا تھا۔ وراثت آبائی کے اصلی مستحق اپنے دل محزوں کو یوں تسلی دے رہے تھے۔

(یہ مخمس دیوان اول میں شامل ہے اور یقیناً اسی کس مپرسی کے عہد کی یادگار ہے)

ستم کرتا ہی بےمہری سے کیا کیا آسماں پیہم — دل اسکے ہاتھ سے پُر درد ہی اور چشم ہی پُرنم
کروں گا پر نہ شکوہ گرچہ ہونگے لاکھ غم پر غم — کیے جاؤنگا میں ہر دم یہی جبتک ہے دم میں دم

خدا دارم چہ غم دارم۔ خدا دارم چہ غم دارم

فلک[1] کے ہاتھ سے کیا کیا مرا دل رنج سہتا ہی — کہ اک اشکوں کا دریا چشم سے دن رات بہتا ہی
نہیں فرصت ذرا غم سے اسی میں غرق رہتا ہی — مگر تائید حق پر جب نظر کرتا ہے کہتا ہے

خدا دارم چہ غم دارم۔ خدا دارم چہ غم دارم

بلا سے گر نہیں کوئی رفیق و آشنا میرا — خدا پر دھیان ہے میرا نگہباں ہی خدا میرا
خدا آساں کرے گا گو ہے مشکل مدعا میرا — خدا حامی ہے میرا اور خدا مشکل کشا میرا

خدا دارم چہ غم دارم۔ خدا دارم چہ غم دارم

نہیں غمخوار کوئی کون کرسکتا ہے غمخواری — توقع جنسے یاری کی تھی وہ کرتے ہیں عیاری
خدا سے اپنے میں کہتا ہوں امید مددگاری — زباں ہی جبتلک منہ میں زباں سے ہی یہی جاری

خدا دارم چہ غم دارم۔ خدا دارم چہ غم دارم

کوئی مغرور اپنے زور پر ہی کوئی دولت پر — کوئی نازاں شکوہ و شان پر ہی کوئی حشمت پر
ظفر تکیہ کیا میں نے فقط اُسکی عنایت پر — خوشی سے میں یہی کہتا ہوں راضی اپنی قسمت پر

خدا دارم چہ غم دارم۔ خدا دارم چہ غم دارم

صدق دل سے مالک الملک پر بھروسہ کرنیوالا کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔ من یتوکل علے اللہ فھو حسبہ. کارساز دو عالم نے ظفر کی بگڑی یوں بنائی کہ مرزا جہانگیر کی عقل پر پردہ پڑگیا اور ایک ایسی نادانی کی حرکت کر بیٹھے کہ ولیعہدی ہمیشہ کے لئے خواب و خیال

[1] پدر ۱۲

ہو گئی۔ ان کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ پچھلی نظربندی اور ذلت و رسوائی کا دل پر داغ تھا۔ مسٹر اسٹین رزیڈنٹ سے چونکہ وہ مرزا ابوظفر کی علی الاعلان پشت پناہی کرتے تھے سخت بغض و عناد تھا۔ ایک دن غصہ کی حرارت ایسی تیز ہوئی کہ بغیر سوچے سمجھے رزیڈنٹ کی بہت توہین کی اور پستول کا فیر کر دیا۔ گولی ٹوپی پر لگی اور بڑے صاحب کو صدمہ نہیں پہونچا لیکن یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ بادشاہ کی سعی بیسود ہوئی اور وہ گرفتار کر کے الہ آباد بھیجدیے گئے۔ وہاں اپنی حسرت و ندامت فراموش کرنے کے لئے دن رات مخمور رہتے تھے۔ دربار شاہی کے نامور طبیب حکیم اشرف خاں معالج تھے لیکن شراب کی کثرت سے روز نئی بیماریاں پیدا ہوتی تھیں۔ آخر کار ۱۸۱۲ء میں وہیں قضا کر گئے۔ ماں کے اصرار سے نعش دلی منگائی گئی۔ اور سلطان نظام الدین اولیا کی درگاہ میں محمد شاہ رنگیلے کی قبر سے متصل انکے لئے ایک خوبصورت مجحر بنوایا گیا۔

انکے صرف ایک بیٹی تھی جو بعد کو مرزا فخرو ولیعہد بہادر شاہ سے منسوب ہوئی۔ اور اسکے ایک فرزند ابوبکر نام پیدا ہوا۔ مرزا فخرو سلطنت کی حسرت دل ہی لیکر زہر یا ہیضہ سے ہلاک ہوئے۔ ابوبکر کا گولی سے کام تمام ہوا۔ ابوبکر کا بیٹا سہراب غدر کے قتل عام کا شکار ہوا۔ اور جہانگیر کا نام و نشان مٹ گیا۔

مملکت کا حالِ زار

ولیعہدی کا تصفیہ ختم ہوا۔ کمپنی بہادر نے اعلان کر دیا کہ وہ سوائے مرزا ابوظفر خلف اکبر کے کسیکو وارث تاج و تخت تسلیم نہیں کریگی۔ لیکن اب ذرا یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس سلطنت کی کیا قیمت تھی جسکی وراثت کے لئے یہ جھگڑے بکھیڑے پڑے تھے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے

کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مرہٹوں کو شکست دیکر شاہ عالم کو اپنی حفاظت میں لیا تھا اور ساڑھے اٹھاسی ہزار ماہوار پنشن مقرر کی تھی جسمیں سے ساٹھ ہزار حضور کے ذاتی مصارف کیلئے اور ۲۲½ ہزار شہزادوں اور دیگر متوسلین کے لئے مقرر تھے۔ گورنر جنرل نے جو عہدنامہ تحریر کیا اسمیں مندرج تھا کہ "جمنا کے مغرب طرف کے محالات بادشاہ کی جاگیر متصور ہونگے۔ انکا انتظام رزیڈنٹ کے سپرد رہیگا لیکن بادشاہ کے اطمینان خاطر کے لئے شاہی متصدی کچہری رزیڈنٹی میں حاضر رہکر ان محالات کی آمدنی و خرچ کا حساب مرتب کیا کرینگے اور بادشاہ کو مطلع کرتے رہینگے۔

اراضی خالصہ سے اسقدر آمدنی ہویا نہو مگر بادشاہ کو انگریزی خزانہ سے حسب ذیل رقوم ماہوار نذر کیجائیں گی۔

حضور پُرنور	۶۰۰۰۰
ولیعہد مع جاگیر	۱۳،۰۰۰
دیگر شہزادگان و شہزادیاں	۱۰،۰۰۰
مرزا ایزد بخش مع جاگیر	۳،۰۰۰
شاہ نواز خاں	۲،۵۰۰
میزان کل	۸۸۵۰۰

فوج اور پولس وغیرہ کے اخراجات آنرایبل کمپنی برداشت کریگی۔ اور ان محالات کی کل نکاسی خام بادشاہ کے نذر ہوگی۔

اگر کاشت میں توسیع ہونے یا رعایا کی حالت میں بہتری واقع ہونے سے ان محالات کی آمدنی میں اضافہ ہو تو بادشاہ کی پیشکش میں بھی رسدی اضافہ کیا جائیگا۔"

ریگولیشن نمبر ۴ سنہ ۱۸۰۵ء کی دفعات ۴ و ۲۲ و ۲۵ میں صاف طور پر درج تھا کہ "جمنا کے داہنے کنارے پر جو محالات ہیں انکی آمدنی نہر محبتی شاہ عالم کے لئے نامزد ہے"

رگولیشن نمبر ۹ سنہ ۱۸۰۵ء کی دفعہ ۳۔ رگولیشن نمبر ۸ سنہ ۱۸۰۵ء کی دفعات ۲ و ۴۔ رگولیشن نمبر ۲ سنہ ۱۸۰۷ء کی دفعات ۱ و ۲۔ اور رگولیشن نمبر ۱ سنہ ۱۸۰۸ء کی دفعہ اول میں بھی ایسا ہی تذکرہ تھا لیکن کچھ عرصے کے بعد ولیعہد کی پنشن میں تین ہزار کی کمی کر دیگئی اور شاہ نواز خاں متوسل شاہی کا وظیفہ ان کے انتقال کے بعد بند کر دیا گیا یعنی ماہواری پنشن بجائے ۵۰۰۰۰ کے صرف ۴۳۰۰۰ رہ گئی۔ اندھے بادشاہ کے مصارف بوجہ معذوری کے بہت کم تھے اور ساٹھ ہزار ماہوار انکی ضروریات کے لئے کافی تھا بلکہ کچھ پس انداز بھی ہو جاتا تھا۔ اکبر ثانی تخت پر بیٹھے تو ان کی ظاہری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ طبیعت میں اولو العزمی اور تعمیرات سے دلچسپی تھی۔ اور زر خرچ کرنیکا شوق تھا۔ جشن تخت نشینی اور شہزادگان جہانگیر و سلیم کی شادیوں میں دل کھول کر صرف کیا گیا۔ جلوس سے سال ہی دو سال کے بعد قلعہ کے ثمن برج سے ملا ہوا ایک مسقف برآمدہ نہایت خوبصورت بنوایا گیا۔ جسکے جھروکے کی محرابوں پر ایک کتبہ اسوقت تک ان کی فراخ حوصلگی کی یادگار ہے۔

نوشت مصرع تاریخ این بنا سید بود نشیمنے عالی اساس اکبر شہ

سنہ ۱۲۲۳ھ

لاہوری دروازہ کے سامنے قدیم پل کی مرمت باہتمام "ولاور الدولہ رابرٹ مکفرسن صاحب بہادر دلیر جنگ" کرائی گئی۔ مرہٹوں کی تاخت میں قلعہ کے "اسد برج" کو نقصان پہونچا تھا وہ از سر نو بنوایا گیا۔ مسجد جامع دہلی کی مرمت ہوئی۔ اور سلطان نظام الدین اولیاء کی درگاہ کا برج سنگ مرمر کا تعمیر کرایا گیا۔

ساٹھ ہزار میں ان شاہانہ حوصلہ مندیوں کی کہاں گنجائش تھی۔ شاہ عالم کا اندوختہ سرمایہ بیدریغ خرچ کیا گیا۔ اور جب وہ ختم ہوا تو اکبر نے غل مچانا شروع کیا کہ پنشن بہت قلیل ہے اسمیں اضافہ کیا جائے۔ مسٹر آرچیبولڈ اسٹین جو [illegible] سے [illegible] تک دلی کے

رزیڈنٹ رہے خاندان شاہی کا احترام کرتے اور بادشاہ کے مصائب سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اُنھوں نے سفارش کی۔ محالات جاگیر کی آمدنی بھی انگریزوں کی دانشمندانہ انتظام سے بڑھ گئی تھی ۱۸۰۹ء میں پنشن کی تعداد ایک لاکھ ماہوار مقرر ہو گئی، یعنی ساڑھے گیارہ ہزار کا اضافہ ہوا۔

بیفکری اور عیش پرستی نے متوسلین قلعہ کی آبادی بہت بڑھادی تھی۔ شہزادوں اور مرشدزادوں کی تعداد کثیر تھی۔ شاہ عالم کے بیٹوں پوتوں کی بڑی بڑی تنخواہیں معین تھیں شادی وغمی کے موقعوں پر اکبر و جہانگیر کی قائم کی ہوئی رسموں پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس خفیف اضافہ سے بادشاہ کی احتیاج اور شہزادوں کی مفلسی کیونکر دُور ہوتی ؟

شہزادوں میں چُوری۔ دغا بازی۔ خونریزی کی خصلتیں جو غربت اور افلاس کے لوازم ہیں پیدا ہوگئی تھیں۔ آوارگی۔ بدمعاشی اور شراب خواری کی عادتیں جو تباہی و فلاکت کا پیش خیمہ ہیں قلعہ میں راسخ تھیں۔ شہر کے مہاجنوں کی ڈگریاں رزیڈنٹ کی کچہری سے شہزادوں پر ہوتی اور اُن کی تنخواہیں قرق ہوتی تھیں۔ سلاطین زادے گرفتاری کے خوف سے قلعہ کی چار دیواری کے باہر نکلتے ڈرتے تھے۔ بوڑھا بادشاہ بے بس تھا۔ بھائی بھتیجے مطلق العنان تھے اور لڑکے آزاد۔ نہ قابو تھا کہ اُنکو بدافعالیوں اور اسراف سے روکے اور نہ استطاعت تھی کہ اُنکے کاسۂ حرص کو پُر کر کے قلعہ کی عظمت برقرار رکھے۔

شامتِ اعمال سے رزیڈنٹی کے منصب پر ۱۸۱۱ء میں سر چارلس تھیوفلس مٹکاف مقرر ہوئے جو خاندان شاہی کی عظمت قائم رکھنے کے خلاف تھے اور جس زمانہ میں کہ وہ مسٹر اسٹین رزیڈنٹ کے مددگار تھے ایک مراسلہ گورنمنٹ ہند کی خدمت میں روانہ کیا تھا جسکا مضمون حسب ذیل بتایا جاتا ہے :۔

"میں اس پالیسی سے موافقت نہیں کرتا جو مسٹر اسٹین نے خاندان شاہی کے ساتھ

اختیار کر رکھی ہے۔ جو شخص برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دہلی میں حکمرانی کیلئے مقرر ہو وہ بادشاہ کی تعظیم اس طرح کرتا ہے جس سے بادشاہی قوت کے بیدار ہونے کا اندیشہ ہے۔ حالانکہ ہم اسکو ہمیشہ کے لئے سُلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا یہ مقصود نہیں ہے کہ بادشاہ کو شاہی کے اختیار و اقتدار دوبارہ حاصل ہوں۔ اسلئے ہمکو ایسی حرکتیں نہیں کرنا چاہیئے جن سے اسکے دل میں اپنی سلطنت حاصل کرنیکی تمنا پیدا ہو۔"

یہ صاحب برسر اختیار ہوئے تو شہزادوں کی تذلیل اور بادشاہ کی توہین کرنے لگے بلکہ بعض ایسی حرکتیں انکی جانب منسوب کیجاتی ہیں جو بعید از انسانیت ہیں۔ شاہی متصدی جو محالات جاگیر کے حساب بادشاہ کو باخبر رکھنے کے لئے رزیڈنٹی میں تعینات تھے علیحدہ کئے گئے اور جاگیر کی آمدنی جو پہلے سے دوچند ہوگئی تھی بادشاہ سے چھپائی جانے لگی۔ شہر دہلی میں قید طویل یا قصاص کے احکام پر بادشاہ کی منظوری لیجاتی تھی اور یہ ایک ہلکا ثبوت بادشاہ کی ملکیت شہر پر ہونے کا باقی تھا۔ یہ رسم بھی موقوف ہوئی۔ ایک موقع پر لارڈ امہرسٹ گورنر جنرل نے صاف الفاظ میں اکبر کو تحریر کر دیا کہ "آپ کی بادشاہی صرف نام کی ہے اور محض اخلاقاً بادشاہ کے خطاب سے یاد کئے جاتے ہیں"۔ دستور تھا کہ بادشاہ کی سواری شہر سے گذرتی تھی تو ہر شخص شاہی آداب ملحوظ رکھنے اور آداب مجرا بجالانے پر مجبور تھا۔ اب حکم ہوگیا کہ انگریزوں کو اثنار راہ میں بادشاہ سلامت کی تعظیم و تکریم کیلئے مجبور کرنا نہایت نازیبا ہے۔ شہر کے باشندے ہنوز خاندان تیموریہ کی عزت کرتے اور بادشاہ سے محبت رکھتے تھے۔ لیکن کمپنی کے ملازمین کو کوئی ہمدردی نہ تھی۔ افلاس نے دیوان خاص کی یہ صورت بنادی کہ "وہ ایک بے ترتیب اور ناکارہ سامان کا انبار خانہ بنگیا۔ ٹوٹی ہوئی پالکیاں خالی صندوق بھکرے پڑے تھے تخت کی یہ حالت تھی کہ کبوتروں کی بیٹ سے ایسا اٹ گیا تھا کہ جواہرات بھی مشکل سے نظر پڑتے تھے"۔ مگر ۱۸۲۵ء میں دہلی کے رزیڈنٹ مسٹر الیٹ

نے مشہور سیاح لشپ ہیبر سے کہا کہ "محلات شاہی کی بری حالت کا سبب کچھ تمول کی کمی نہیں ہے بلکہ ان لوگوں نے محض اپنی بے پروائی سے ایک ایسی عمارت کی نگرانی و مرمت حتیٰ کہ معمولی صفائی تک چھوڑ دی جو خود انکی گذشتہ عظمت کی یادگار تھی"

کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحلہا !!

بدقسمتی سے سر چارلس مٹکاف دوبارہ دلی کے رزیڈنٹ مقرر ہو گئے اور ۱۸۲۵ء سے ۱۸۲۷ء تک اس عہدۂ جلیلہ پر سرافراز رہے۔ اکبر ثانی کی رنج و مصیبت کا پیالہ ایسا لبریز تھا کہ ایک بوند کی گنجایش باقی نہ تھی، اپنے لڑکے کی معرفت جو لکھنؤ میں قیام پذیر تھے نواب وزیر سے سفارش اٹھوانا چاہی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ گورنر جنرل کے پاس وکیل بھیجے لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر بنگال کے مشہور مصلح برہمو سماج کے لیڈر راجہ رام موہن رائے کو سفیر بنا کر لندن بھیجنے کا ارادہ کیا۔ عہدناموں کی نقلیں بمشکل فراہم ہوئیں اور قابل راجہ نے جارج چہارم بادشاہ انگلستان کے نام ایک نہایت پُر زور اور مدلّل عرضداشت بادشاہ کی طرف سے مرتب کی جسمیں ان شرائط کا حوالہ تھا جو شاہ عالم ثانی کے وقت میں کمپنی سے طے ہوئے تھے اور مطالبہ کیا گیا تھا کہ محالات جاگیر کی کل آمدنی جو اسوقت تیس لاکھ کے قریب پہونچگئی تھی بادشاہ کو ملنا چاہیئے۔

اسکا آخری حصہ نہایت دردناک تھا اور نہایت عاجزی سے شاہ انگلستان کی توجہ اولاد تیموریہ کی خستہ حالی اور قلعۂ معلّیٰ کی تباہی کی طرف منعطف کرائی گئی تھی۔

یہ عرضداشت اور سفارت کی سند لیکر راجہ رام موہن رائے لندن گئے۔ وہاں خاطر مدارات کافی ہوئی لیکن مقصود حاصل نہوا۔ با اثر حلقوں میں وعدہ کیا گیا کہ اضافہ کی درخواست پر غور ہوگا مگر اکبر ثانی کا پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا اور پیمان پورا نہوا۔

ظفر کے دیوان اول میں ایک مسدّس ہے جو اسی عہد کی آشفتہ حالی کا مرثیہ ہے ؎

کیا پوچھتے ہو کجروی چرخ چنبری، ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستمگری
کرتا ہی خوار تر انھیں جنکو ہے برتری اسکے مزاج میں ہی یہ کیا سفلہ پروری

کھائے ہی گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہی زاغ کہاں اور کہاں ہما (سبحان اللہ)

بالعکس ہیں جہاں میں جہانتک ہیں کاروبار شیوہ کیا ہے اُلٹا زمانہ نے اختیار
ہی موسم بہار خزاں اور خزاں بہار آئی نظر عجب روش باغ روزگار

جو نخل پر ثمر ہیں اُٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

باد صبا اُڑاتی چمن میں ہی سر پہ خاک ملتے ہیں دمبدم کف افسوس برگ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلو نکے جگر ہیں چاک کرتی ہیں بلبلیں بھی فریاد دردناک

شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہو خوار نخل مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطہ سے ہم کہاں ہو دیگا سر پہ چرخ بھی جائینگے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں چھٹنا محال اس سے ہی جبتک ہے تن میں جاں

جو آگیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہی وہ قید فرنگ میں

یہ گنبد فلک ہے عجب طرح کا قفس طاقت نہیں ہی نالہ کی بھی جسمیں یکنفس
جنبش ہو ایک پر کی تو پر ٹوٹ جائیں دس رہجائے دلمیں دل کی نہ کسطرح سے ہوس

کیا طائر اسیر وہ پرواز کر سکے
جسمیں نہ اتنا دم ہو کہ پرواز کر سکے (حسب حال ہی)

کیا کیا جہاں میں ہو چکے شاہان ذی کرم ۔۔۔ کس طرح کا رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم ۔۔۔ دارا کہاں؟ کہاں ہے سکندر؟ کہاں ہے جم

کوئی نہ یاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے

یہ رنج و مصیبت کی داستان کہاں تک بیان کیجائے۔ مختصر یہ ہے کہ ۱۸۳۲ء میں دلی صوبہ مغربی و شمالی میں شامل ہوئی اور اس اشتباہ کی گنجایش باقی نہ رہی کہ قدیم دارالسلطنت پر ہنوز بادشاہ معزول کی ملکیت برقرار ہے ۱۸۳۵ء سے سکہ "کمپنی بہادر" کا رائج ہو گیا۔ اور مغل بادشاہ کا نام خارج کر دیا گیا۔ وہ اقبال مند قیصرہ جبکا جشن شاہنشاہی ۴۰ برس کے بعد دہلی مرحوم میں دھوم دھام سے منعقد ہونے والا تھا انگلستان کے تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو شام کے وقت اکبر و جہانگیر کا فرزند جو اخلاقاً بادشاہ دہلی کے خطاب سے سرفراز تھا بیاسی برس کی عمر میں اُس عالم کیطرف راہی ہوا جہاں شاہ و گدا کا مرتبہ یکساں ہے۔

شاہ اکبر فروغ بخش جہاں ۔۔۔ منخسف گشت از قضا چوں بدر
پئے سال وفات گفت ظفر ۔۔۔ عرش آرام گاہ عالی قدر
۱۲۵۳ھ

(ایضاً از ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم)

چوں برفت از جہاں شہ اکبر ۔۔۔ شد سیاہ آسمان ز دود جگر
پائے شادی شکست و احمد گفت ۔۔۔ سال تاریخ او "غم اکبر"

۱۰ - ۱۲۶۳ = ۱۲۵۳

بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی

دیوان خاص کے فردوس میں آخری بہار آئی ۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۲۹ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو سنیچر کے دن مرزا ابوظفر "بہادر شاہ ثانی" ساعت سعید میں محل سے برآمد ہوئے جامع مسجد دہلی کے امام[1] میر احمد علی نے رسم تاجپوشی کا افتتاح کیا۔ جھنڈیاں ہلیں۔ توپیں چلیں۔ فوج نے سلامی اتاری شادیانے بجے۔ رزیڈنٹ نے نذر پیش کی۔ اور سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے تخت نشینی کی مبارکباد دی۔ ولیعہد خلافت مرزا دارا بخت اور دیگر شہزادگان والا تبار نے یکے بعد دیگرے آداب گاہ سے مجرا کیا۔ بادشاہ کے قریب جاکر نذر دی خلعت پایا۔ دوسرے امرا کی نوبت آئی۔ آداب مجرے ہوئے۔ نذریں گذریں۔ خطابات و مناصب تقسیم ہوئے

از نشۂ دولت بہادر شاہی — شد پُر ز مئے طرب ایاغ دہلی

بنشست بہ تخت دولتِ روز افزوں — نزہت بفزود از دماغ دہلی

تاریخِ جلوسِ آں شہِ والاقدر — آمد بہ لب خرد چراغ دہلی

۱۲۵۳ھ

اگلی عظمت کا داغ تازہ رکھنے کیلئے سکہ بھی موزوں کیا گیا:۔

بسیم و زر زدہ شد سکہ بفضل اللہ — سراجِ دیں ابوظفر شہ بہادر شاہ

کن کن خوش نصیبوں نے خطابات پائے شہزادوں اور نوابوں کو کس کس قسم کے خلعت

---

[1] جامع مسجد دہلی کے پہلے امام سید عبدالغفور بخاری تھے ۱۰۶۶ھ میں تقرر ہوا۔ امام السلطان خطاب ملا، جاگیر مرحمت ہوئی۔ اورنگ زیب کی تاجپوشی انھیں کے مقدس ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ اُسوقت سے یہ رسم قائم ہوگئی کہ تاجپوشی کا افتتاح امام مسجد ہی کیا کرتے تھے ۱۲

عطا ہوئے ؟ بخشی گیری، نظارت اور داروغگی وغیرہ معزز عہدوں پر کون کون عالی منزلت متقرر ہوئے کچھ معلوم نہیں اور یہ واقفیت اگر کسی ذریعہ سے حاصل بھی ہو سکے تو چنداں مفید اور دلچسپ نہیں، اسقدر ثابت ہے کہ مغل بیگ نام ایک مرد مومن نام کے مغل ذات کے جولاہے اپنی خوشامد اور ظفر کی چشم مروت کی بدولت ولیعہدی کے زمانہ میں مختار کل تھے عہدۂ وزارت سے سربلند ہوئے اور "نواب حمید الدولہ مرزا مغل بیگ خان بہادر" خطاب پایا۔

ہنس کے ہاتف نے کہا اسکو کرواہ   کیا ہی انٹی میں وزارت آگئی

بادشاہ کے اُستاد شیخ ابراہیم ذوقؔ جو پہلے صرف للعہ، پر ملازم ہوئے تھے اور بعد کو ترقی پاکر پانچ سات روپیہ مہینہ پانے لگے تھے اب سنہ کے منصب پر پہونچے۔ نہایت افسردہ اور رنجیدہ رہتے اور مولانا آزاد کے قول کے مطابق کہتے پھرتے تھے کہ

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

داروغگی نذر ونیاز اور نقیب الاولیا کے عہدے اسوقت بہت معزز تھے۔ پہلے پر "خلیفۃ الملک ندیم الدولہ حافظ محمد داؤد خاں مستقیم جنگ" کا تقرر ہوا اور دوسرے پر جسکے سپرد تمام نقیروں اور گوشہ نشینوں کی خبرگیری تھی۔ حاجی[1] غلام علی مامور ہوئے۔ مولانا فخر الدین چشتی کے پوتے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کو جو اپنے والد غلام قطب الدین کی وفات کے وقت خورد سال تھے اور حضرت محمد سلیمان تونسوی سے خرقۂ خلافت حاصل کرکے سجادہ آبائی پر رونق افروز ہوئے تھے۔ زمانہ ولیعہدی میں مرزا ابوظفر کو اذکار واشغال صوفیہ کی تعلیم دینے کا شرف

---

[1] یہ بزرگ خواجہ نصیر الدین احرار کی اولاد میں تھے "علی امام من است ومن غلام علی" سجع تھا۔ اور غلام علی تاریخ ولادت ۱۲

نصیب ہوا تھا۔ اب بادشاہ کے پیر و مرشد[1] مشہور ہوگئے۔
خانقاہ میں دولت ظاہری کا اتنا انبار لگا کہ فقیری پر امیری۔ گدائی پر شاہی کا اطلاق ہونے لگا
پیر پرست بادشاہ ساہوکاروں سے قرض لیتا۔ سودی دستاویزیں تحریر کرتا۔ املاک شاہی کفالت
میں دیتا مگر بزرگ زادہ کی خدمت بجالاتا تھا۔ پیر صاحب نے ملکہ بیگم نام ایک شہزادی سے نکاح
بھی کرلیا تھا اور صاحب جائداد ہوگئے تھے۔ بادشاہ کے خزانہ سے لاکھوں روپیہ نذر و نیاز کیلئے
مختلف اوقات پر ملا۔ اسکا کیا حساب۔ احسن[2] الاخبار بمبئی کے نامہ نگار کی شہادت ہے کہ ۱۸۴۶ء

---

[1] انکی شان میں ارشاد ہوتا ہے۔

نظام خانۂ فخر جہاں تمھیں تو ہو　　قیام سلسلہ و خانداں تمھیں تو ہو　　نہ کیونکہ تم سے ہوں ظاہر صفات قطب الدین
خدا رکھے تمھیں اُنکا نشاں تمھیں تو ہو　　تمھارے در پہ جھکا کر سر ارادت خلق　　کہے ہے کعبۂ امن و اماں تمھیں تو ہو
نثار تم پہ ہیں پروانہ سان ہزاروں دل　　کہ شمع محفل صاحبدلاں تمھیں تو ہو　　تمھاری قوت باطن سے تقویت ہے مجھے
کہ میری باعث تاب و تواں تمھیں تو ہو　　بغیر آپکے ہو کیونکہ جان و دل بچین　　کہ راحت دل و آرام جاں تمھیں تو ہو

ظفر کی چاہیئے نصرت تمھیں نصیرالدیں،
کہ اُس کے یار و مددگار ہاں تمھیں تو ہو

[2] غدر سے دس پندرہ سال پہلے احسن الاخبار نام ایک فارسی اخبار بمبئی سے شایع ہوتا تھا۔ اور اسمیں دہلی کے متعلق بہت دلچسپ خبریں ہوا کرتی تھیں۔ اگر اس اخبار کا مکمل فائل دستیاب ہو جاتا تو بہادر شاہ مرحوم کی نہایت مفصل سوانحعمری مرتب ہو سکتی۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی کو اسکی ناتمام جلدیں دو تین سال کی حیدرآباد میں ملیں اور اُنھوں نے اسکے بعض مضامین کا ترجمہ "دہلی کا آخری سانس" کے نام سے شایع کیا۔ راقم الحروف نے اس ترجمہ سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے اور مختلف مقامات پر اسکی عبارتیں شہادت میں پیش کی ہیں۔ جن رئیسوں اور نوابوں کا نام اس اخبار میں جگہ جگہ آتا ہے افسوس کہ آج اُنکا کچھ نشان نہیں اور بیشتر کی بابت یہ بھی دریافت نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھے اور کس دیار کے رہنے والے تھے !!

میں صرف نوماہ کے اندر اٹھارہ ہزار روپیہ سے زاید ان کو عنایت کیا گیا۔

(۳۰ ستمبر ۱۸۴۶ء) "موضع شمعپور باؤلی کی آمدنی میں سے مبلغ پانچسو روپیہ حضرت شاہ غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کو مرحمت فرمائے اور ارشاد کیا کہ اس آمدنی میں سے ہمیشہ پانچسو روپیہ انشاء اللہ قبل از طلب حاضر خدمت ہو جایا کرینگے۔"

(دو ماہ بعد)

(۴ دسمبر ۱۸۴۶ء) "حکیم احسن اللہ خان بہادر سے ارشاد ہوا کہ پیرزادہ حضرت شاہ غلام نصیر الدین صاحب کو نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی معرفت چار ہزار روپیہ بھیجدیا جائے۔"

(چار ماہ بعد)

(۲ اپریل ۱۸۴۷ء) کارپردازان خلافت کو حکم دیا گیا کہ حضرت میاں کالے صاحب، نبیرہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی کی شادی ہے۔ دس ہزار روپیہ انکے خرچ کے لئے عطا کیا جائے۔"

(دو ماہ بعد)

(۲۵ جون ۱۸۴۷ء) "صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ جاری فرمایا کہ نواب زینت محل بیگم صاحبہ نے محبوب علیخاں خواجہ سرا کی معرفت دس ہزار روپیہ قرض لیا ہے۔ یہ قرضہ دو ہزار روپیہ سالانہ کے حساب سے قسط وار ادا کیا جائے۔ اسمیں سے چار ہزار روپیہ میاں کالے صاحب پیرزادہ کے صاحبزادے کی شادی کے خرچ کے لئے ہے۔"

علاوہ پیر و مرشد کے اور بھی معززین دربار تھے جن کی بوقت ضرورت اعانت ہوتی تھی اور تنخواہ بھی مقرر تھی۔ مثلاً وزرا۔ استادان۔ علما۔ حکما۔ شہزادگان۔ نواب ناظر۔ بخشی فوج۔ مہتمان کارخانہ جات۔ عرض بیگیاں وغیرہ وغیرہ۔

دربار کی رونق کیلئے تھوڑی سی فوج بھی رہتی تھی جبکی چھ پلٹن اور اگری پلٹن نے

غدر میں شہرت پائی۔ ایک رسالہ سوار دنکا بھی ملازم تھا۔ اور حسب ذیل کارخانہ جات شاہی تھے
خاصہ کلاں۔ خاصہ خورد۔ آبدار خانہ۔ دوا خانہ۔ توشہ خانہ۔ جواہر خانہ۔ سلح خانہ۔ فیل خانہ۔
اصطبل۔ بگھی خانہ۔ توپ خانہ۔ شتر خانہ۔ رتھ خانہ۔ کارخانہ جلوس ماہی مراتب۔ بخشی خانۂ فوج،
کتب خانہ۔ کبوتر خانہ۔ داروغہ نذر و نیاز۔ داروغہ فراش خانہ۔ پالکی خانہ۔ داروغہ کہاران۔ داروغہ
خاص برداران۔ افسر خواجہ سرایاں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اخراجات شاہی و سخاوت

مصیبت کے وقت بدباطن کمپنوں نے فوجی عدالت کے سامنے ظاہر کیا کہ بادشاہ لالچ کے بندے تھے اور روپیہ کی پرستش کرتے تھے۔ کسی کے منہ سے نہ نکلا کہ انکے شاہانہ اخراجات اسقدر بڑھے ہوئے تھے کہ خزانہ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ اور فیاضی سخاوت کی حد سے گزر کر اسراف تک جا پہونچی تھی۔ وہ صرف پیرزادہ ہی کی خدمت نہیں کرتے بلکہ تمام متوسلین شاہی کی شادی و غمی کے موقع پر امداد کرتے تھے۔ بطور مشتے نمونہ از خروارے چند مثالیں احسن الاخبار سے نقل کیجاتی ہیں :-

(۱) "نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر کے فرزند ارجمند کی تقریب شادی میں خلعت سہ پارچہ اور سہرہ مقیشی اور تفضل حسین خاں وکیل عدالت دیوانی کے فرزند کی شادی میں خلعت سہ پارچہ بادشاہ سلامت نے مرحمت فرمایا"۔ (۱۶ جنوری ۱۸۴۶ء)

(۲) "نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی دادی نواب نوازش علیخاں کی زوجہ محترمہ فوت ہو گئیں حکم ہوا کہ ۱۵۰ روپیہ تجہیز و تکفین کے لئے اور خلعت ماتمی کے طور پر تین دوشالے انکے وارثوں کے پاس بھیجدئے جائیں" (۲۵ ستمبر ۱۸۴۶ء)

(۳) "مرزا الف بیگ خاں کو انکی والدۂ مرحومہ کی تعزیت کے طور پر خلعت شش پارچہ مرحمت ہوا۔" (۲۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء)

(۴) "نواب غلام محی الدین خاں بہادر کی تقریب ماتم میں انکے صاحبزادے مفخر الاسلام نواب قطب الدین خاں بہادر کو خلعت شش پارچہ اور اُنکے چھوٹے بھائی کو خلعت سہ پارچہ بادشاہ سلامت کیطرف سے عطا کیا گیا۔" (۶۔ نومبر ۱۸۴۶ء)

(۵) نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم کے بڑے صاحبزادہ معین الدولہ نظارت خاں وغیرہ حاضر دربار ہوئے۔ بادشاہ سلامت نے مرحوم کی خدمات جلیلہ کا ذکر فرما کر انکی وفات حسرت آیات پر بہت رنج و غم کا اظہار کیا اور صبر کی تلقین فرمائی۔ پھر خلعت شش پارچہ اور نیم آستین نقرئی خلف ثانی منظفر الدولہ بہادر کو خلعت پنج پارچہ آغا مرزا کو اور ایک ایک دوشالہ انکی صاحبزادی اور زوجہ کو مرحمت فرما کر رخصت کیا۔ مرحوم کے پسماندگان نے منجموں کی رائے کے موافق زر و جواہر اور دوسری چیزیں مرحوم کے نام سے فقیروں اور غریبوں کو بطور خیر خیرات تقسیم کیں۔" (۱۲۔ نومبر ۱۸۴۶ء)

(۶) "خبر آئی کہ علیم اللہ رکابدار جو حرمین شریفین کی زیارت کے لئے گیا ہوا تھا راستہ میں فوت ہو گیا۔ مرحوم کے لڑکے کے پاس تعزیت کے طور پر خلعت سہ پارچہ روانہ کیا گیا" (۲۹ جنوری ۱۸۴۷ء)

(۷) "سید محمد امیر صاحب خوشنویس کے لڑکے کی شادی کے موقع پر بادشاہ سلامت نے ایک پورا جوڑا اور سہرہ مقیشی مرحمت فرمایا" (۱۳۔ فروری ۱۸۴۷ء)

(۸) "بادشاہ سلامت نے محمد حسین بیگ کے بھائی کو انکی والدہ کی وفات کے موقع پر خلعت سہ پارچہ اور خواجہ بابر اور میر ہدایت علی سر حوکی خواصان کو خلعت دو پارچہ مرحمت فرمایا" (۲۱۔ اپریل ۱۸۴۷ء)

(۹) "ظفر علیخاں نے اپنے لڑکے کی شادی کی تقریب میں نذرانہ پیش کیا اور حضور انور نے انکو خلعت فرخ سیری بالابند۔ اور سہرہ مروارید کے عطیہ سے سرفراز فرمایا" (۲۳۔ اپریل ۱۸۴۷ء)

(۱۰) "کنور سالک رام کے لڑکے کنور گوپال سنگھ کی شادی میں بادشاہ سلامت نے خلعت فرخ سیری، جامہ، کمر بند، سہرۂ مقیشی روانہ فرمایا۔ اور کنور کا لقب دیا۔ اور حکم دیا کہ شاہی خرچہ سے کنور گوپال سنگھ کی شادی کا جلوس شاہانہ تزک و احتشام سے نکالا جاوے"۔
(۱۲۔ مارچ ۱۸۴۷ء)

(۱۱) بہاری لعل (متصدی حویلی) کی دادی نے وفات پائی۔ بادشاہ سلامت نے تعزیت کے طور پر خلعت سہ پارچہ مرحمت فرمایا۔ کنور دیبی سنگھ کے چچا زاد بھائی پران ناتھ نے وفات پائی۔ بادشاہ سلامت نے تعزیت کے طور پر انکو بھی خلعت عطا فرمایا۔ رام دیال گوجر کے مرنے پر اسکی زوجہ کو ماتم پرسی کے طور پر ایک دوشالہ عطا کیا" (۴ امئی ۱۸۴۷ء)

(۱۲) "راجہ سوہن لعل فوت ہو گئے۔ بادشاہ سلامت نے انکے بڑے لڑکے کو خلعت شش پارچہ اور چھوٹے لڑکے کو خلعت پنج پارچہ اور چاروں لڑکیوں کو ایک ایک جوڑا دوشالہ اور اُنکی بیوی کو ایک شال مرحمت فرمائی"۔ (۱۸ جون ۱۸۴۷ء)

(۱۳) نواب حامد علیخاں کے بھتیجے میر فیاض علی خاں کو اُنکی شادی کی تقریب میں بادشاہ سلامت نے دستار بالابند، سہرۂ مقیشی، خلعت فرخ سیری مرحمت فرمایا۔ روشن علی اور سرفراز علی کو خلعت سہ پارچہ و یک رقم جواہر مرحمت فرمایا"۔ (۳۰۔ اپریل ۱۸۴۷ء)

عید بقر عید۔ عاشورہ کے دن اولوالعزمیوں کی بہار دیکھئے

عید الفطر (۱)

"بادشاہ سلامت عید الفطر کی نماز کیلئے مرشد زادۂ آفاق مرزا ولی عہد بہادر کے ساتھ عید گاہ تشریف لیگئے اور نماز پڑھنے کے بعد شاہانہ جاہ و حشم اور ملوکانہ شان و شوکت کیساتھ ملازمین اور سرداروں کے جھرمٹ میں عید گاہ سے واپس تشریف لائے۔ جو شان و شوکت

بادشاہوں کے شایان شان ہوتی ہے اُسکا اہتمام وانتظام کیا گیا تھا۔ لوگ راستہ میں ہر جگہ بادشاہ سلامت کی خدمت میں تحفۂ دعا اور ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے تھے۔ آمد ورفت کے وقت سلامی کی توپیں اسقدر بلند آواز کے ساتھ چھوڑی گئیں کہ انکی آواز فلک الافلاک تک پہونچی ہر غریب امیر کو انعامات خلعتہائے فاخرہ اور زرنقد تقسیم فرمایا گیا۔ بادشاہ کے انعام واکرام سے ارکین سلطنت بھی بہرہ اندوز ہوئے۔ اور غریب غربا بھی شاہی داد ودہش اور بذل وسخا سے مالامال ہو گئے"۔ (۹۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء)

(۲)

"حضرت بادشاہ غازی ہفتہ کے دن شوال کی پہلی تاریخ کو قلعۂ مبارک سے باہر تشریف لائے اور عید کی نماز پڑھنے کو عیدگاہ تشریف لے گئے۔ نماز جماعت کے ساتھ ادا کی اور حسب معمول نیاز کے لئے درگاہ آثار شریف میں حاضر ہوئے۔ درگاہ شریف کے متولی جہاندار شاہ کو خلعت شش پارچہ اور امام جماعت کو خلعت وشمشیر عنایت ہوئے۔ اور واپس قلعۂ معلیٰ میں آئے۔ آتے جاتے وقت حسب ضابطہ شاہی اور انگریزی توپخانوں سے سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ شام کے وقت تخت ہوادار پر سوار ہو کر ناظر کے باغ میں رونق افروز ہوئے محفل رقص وسرود منعقد ہوئی۔ محفل کے ختم ہونے کے بعد محل خاص میں تشریف لیجا کر آرام فرمایا۔ ہر طرف سے مبارکباد کی آوازیں آئیں۔ اور توپخانہ سے سلامی کی توپیں چھٹیں"۔ (۴۔ اکتوبر ۱۸۴۵ء)

عید الضحیٰ

(۱)

"بادشاہ سلامت بقرعید کے دن زرق برق کپڑے پہنکر اور جواہرات نفیسہ زیب جسم فرما کر شاہانہ تزک واحتشام کے ساتھ عیدگاہ تشریف لیگئے۔ نماز سے فارغ ہونیکے بعد عیدگاہ کے

امام صاحب اور جامع مسجد کے امام صاحب اور کسی دوسرے امام صاحب کو خلعتہائے فاخرہ مرحمت فرمائے" (۳۔ جنوری ۱۸۴۶ء)

(۲)

"بروز عید الضحیٰ بادشاہ سلامت زرق برق لباس زیب تن فرماکر بہت عمدہ گھوڑے پر سوار ہو کر عید گاہ تشریف لیگئے۔ نماز سے فراغت حاصل کرنے کے بعد خلعت شش پارچہ۔ دو رقم جواہر۔ ایک قبضہ شمشیر مع پرتلہ خطیب صاحب کو اور کمخواب کی قبا۔ سہ رقم جواہر۔ ایک دستار سربستہ اور گوشوارۂ منقش ایک دوشالہ متولی مصلیٰ کو اور خلعت شش پارچہ۔ سہ رقم جواہر اور قبضہ شمشیر وقار الدولہ ناظم امور خانسامانی کو مرحمت فرمائے۔ اُسکے بعد اونٹ کی قربانی کیگئی۔ اور حاضرین مجلس نے نان وکباب کا شغل فرمایا۔ اُسوقت نہایت شادمانی اور فرحت کا ساز وسامان تھا۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے میں مصروف نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سے مبارکباد مبارکباد کی صدائیں آرہی تھیں جس راستہ سے بادشاہ سلامت کی سواری گذری اُمرا وزُرسا اور اراکین سلطنت نے عید کی مبارکبادیں پیش کیں۔ اور نذریں بھی گذرانیں۔ آتے جاتے وقت شاہی اور انگریزی توپخانہ سے نہایت بلند آواز کے ساتھ سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں"۔ (۲۵۔ دسمبر ۱۸۴۶ء)

عاشورہ

"حضور انور عاشورہ کے دن درگاہ شریف کے آثار کی زیارت کیلئے تشریف لے گئے مرزا جہاندار شاہ متولی کو خلعت قبائے خاص۔ سہ رقم جواہر۔ دستار سربستہ۔ گوشوارہ مرصع اور حافظ قطب الدین کو خلعت شش پارچہ۔ سہ رقم جواہر اور اُن کے لڑکے کو خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر۔ اور سادات عالی درجات کو پہننے کے کپڑے اور زر نقد اور فقرا ومساکین کو نیاز کا کھانا

مرحمت فرمایا" (۲۳ جنوری ۱۸۴۷ء)

خدمتگاروں، ملازموں، اور حاضر باشوں پر زر پاشی اسطرح ہوتی تھی

(۱) "حضور انور نے نتھو خاصہ تراش (حجام) کو خلعت سہ پارچہ و یک رقم جواہر اور اللہ رکھا کو خلعت سہ پارچہ اپنے دست مبارک سے مرحمت فرمایا"۔

"راجہ بھولا ناتھ نے حضور پیران پیر کے عرس کے فرائض کو خیر و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ بادشاہ نے انھیں خلعت شش پارچہ اور سہ رقم جواہر مرحمت فرمایا"۔

"مولوی تیغ علی کیدانی کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ بادشاہ سلامت نے انکو از راہ عنایت خسروانہ خلعت پنج پارچہ و سہ رقم جواہر سے معزز و ممتاز فرمایا"۔ (۲۳ اپریل ۱۸۴۷ء)

(۲) "حضرت بادشاہ سلامت حضور قطب صاحب کے مزار پر رونق افروز ہوئے۔ درگاہ کے قریب جو محل بنوایا ہے اُسکے صحنخانہ کو ملاحظہ فرماکر چھپر بندوں کے افسر کو ایک جوڑا دوشالہ مرحمت فرمایا"۔ (۱۳ جون ۱۸۴۵ء)

(۳) "بادشاہ سلامت نے سید ابوالقسم خاں کے بڑے صاحبزادے سید محمد رضا خاں کو خلعت شش پارچہ اور سہ رقم جواہر سے سرفراز فرمایا۔ امین الرحمٰن خاں کے لڑکے کریم الرحمٰن کو بادشاہ نے ایک جوڑا دوشالہ اور مکرم الدولہ بہادر تہور جنگ کے خطاب سے معزز فرمایا"۔ ۲۹ جنوری ۱۸۴۶ء

(۴) "قلعہ کی کوتوالی پر نواب یار خاں کا تقرر عمل میں آیا۔ بادشاہ سلامت کی طرف سے خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر مرحمت کئے گئے"۔ (۱۰ اکتوبر ۱۸۴۵ء)

(۵) لالہ شونجی رام وکیل کو خلعت شش پارچہ۔ سہ رقم جواہر اور دو سو روپیہ خرچ راہ کیلئے عنایت کئے گئے اور انکے محرر کو بھی خلعت سہ پارچہ مرحمت ہوئی"۔ (۱۴ نومبر ۱۸۴۵ء)

(۶) "بادشاہ سلامت نے خلیفہ محمد اسمٰعیل خلف شیخ ابراہیم ذوقؔ کو خلعت شش پارچہ و سہ رقم جواہر

عنایت کئے"۔ (۵ جون ۱۸۴۶ء)

(۷) "مرزا غلام فخر الدین کو عہدۂ نظارت کے حصول کی تقریب میں خلعت شش پارچہ و سہ رقم جواہر مرحمت فرمایا اور بیگم صاحبہ کے داماد حسین مرزا کو خلعت پنج پارچہ اور دو رقم جواہر مرحمت فرمایا" (۱۴۔ اگست ۱۸۴۶ء)

(۸) "بادشاہ سلامت کی طرف سے بھگوانداس کو خلعت پنج پارچہ و دو رقم جواہر اور خلعت پارچہ سہ پارچہ و یک رقم جواہر اُنکے گماشتہ کو مرحمت کیا گیا" (۴۔ دسمبر ۱۸۴۶ء)

(۹) "مرزا احمد تقی بہادر کو جو لکھنؤ سے آئے ہیں بادشاہ سلامت نے ایک کمخواب کی قبا۔ دوشالہ۔ گوشوارہ۔ دستار۔ سہ رقم جواہر مرحمت کر کے معزز فرمایا۔ مختار الدولہ وحید الدین خاں بہادر کو خلعت پنج پارچہ اور سہ رقم جواہر عطا فرمایا" (۱۹۔ مارچ ۱۸۴۷ء)

فقرا مشائخ اور درویشوں کی دستگیری کا تھوڑا سا کرشمہ ملاحظہ فرمائیے

(۱) "درگاہ شاہ بو علی قلندر واقع پانی پت کے خدام نے تبرک پیش کیا۔ حضور والا نے دس روپیہ انعام دئیے۔ جن فقیروں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے عرس شریف کی یادگار کے طور پر ڈیوڑھی خاص پر خواجہ صاحب کا جھنڈا لگایا تھا۔ بادشاہ سلامت نے ان کو ایک سو روپیہ نقد اور نقرئی چراغ درگاہ میں نذر کے لئے مرحمت فرمایا اور کھانے کے خوان بھیجے اور زر نقد دستور کے موافق حضرت قطب صاحب کی چھڑیوں کیلئے بھی تقسیم فرمایا۔ میزان شاہ درویش کو جو مکہ معظمہ کی زیارت کیلئے گئے تھے۔ بادشاہ سلامت نے پچیس روپیہ عطا فرمائے"۔ (۱۸۔ جولائی ۱۸۴۵ء)

(۲) "حضور غریب نواز" خواجۂ اجمیر کی مہندی روانگی کے لئے تیار تھی۔ بادشاہ سلامت نے ایک سو روپیہ مرزا بہادر بخش کو مہندی کیلئے مرحمت کئے اور ساتھ جانے کا حکم دیا۔ اور ایک دو چوبہ۔ دو عدد اونٹ فراشوں اور سائبانوں کے ساتھ مہندی کے ہمراہ کر دئے۔ اور خود اولیا مسجد

ایک مہندی کی مشایعت کیلئے تشریف لائے پھر میلہ کو رخصت کر کے مراجعت فرمائی۔

"چند خواجہ سراؤں نے سفر حج کا ارادہ ظاہر کیا۔ بادشاہ سلامت نے ہر ایک کو خرچ راہ کیلئے سو سو روپیہ عطا فرمائے۔" (۱۰۔ جولائی ۱۸۴۵ء)

(۳) "زور آور چند کو حکم ہوا کہ پانچسو روپیہ حضرت عرش آرامگاہ (اکبر ثانی) کے عرس میں خود جاکر صرف کرو۔ حکم کی تعمیل میں زور آور چند نے خوانہائے طعام محل میں بھجوا دئے جسے سردار دل اور دیگر اشخاص میں تقسیم کر دیا گیا۔ حضور والا نے فاتحہ پڑھی اور فی کس پانچ روپیہ اور درویشوں کو ایک ایک فرد کمبل مرحمت فرمائے۔ اور پھر آتشبازی کے نظارہ اور قوالی کے سننے میں مصروف ہوئے۔" (اگست ۱۸۴۵ء)

(۴) "حضرت جہاں پناہ حضور قطب صاحب اور حضرت مولانا فخر صاحب اور حضرت عرش آرامگاہ کے مزارات پر تشریف لے گئے۔ گیارہ گیارہ روپیہ اور گلاب کا شیشہ ہر ایک مزار پر نذر دیا۔ ایسے ہی دوسرے اولیائے کرام کے مزارات پر بھی حاضری دی اور ہر مزار پر پانچ روپیہ نیاز کے لئے دئے۔" (۱۴۔ نومبر ۱۸۴۵ء)

(۵) "محمد علی درویش حاضر ہوئے اور مکہ معظمہ جانیکا ارادہ ظاہر کیا۔ بادشاہ سلامت نے پچیس روپیہ عنایت کئے۔ خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ کی نیاز کے لئے ایک چاندی کا چراغ۔ ایک نقارہ کا جوڑا۔ ایک اشرفی اور پانچ روپیہ مہندی لیجانے والے فقرا کو دئے گئے۔ نواب تاج محل کو چوڑیوں کے لئے پانچسو روپیہ عنایت ہوئے۔ اور سو روپیہ حضرت خواجہ غریب نواز کی درگاہ کے لئے اور خلعت سہ پارچہ وکیل متعینہ کیلئے چھڑیوں کے میلہ کی تقریب میں عطا کئے۔

حضرت عرش آرامگاہ (اکبر ثانی) کے عرس کی تقریب میں ایک ہزار توڑے محلات شاہی میں اور پانچسو توڑے امرا میں تقسیم کئے گئے۔" (۱۰۔ جولائی ۱۸۴۶ء)

(۶) "فرقۂ مداریہ ملنگ کے سرگروہ ایرانی شاہ کو بادشاہ سلامت نے خلعت سہ پارچہ اور

دو اشرفیاں عطا فرمائیں۔ اور اُن کے مریدوں میں سے ہر ایک کی دعوت فرما کر سب کو دل شاد کیا۔ اور اسکے ساتھ نقدی بھی مرحمت فرمائی" (۱۹۔ مارچ ۱۸۴۱ء)

(۷) "حسب دستور قدیم بادشاہ کے جسم مبارک کے وزن سے ترازو نے بلند پلّہ ہونے کا شرف حاصل کیا اور وزن کے موافق غربا اور مستحقین میں خیرات تقسیم کیگئی۔ ارشاد ہوا کہ ہماری دادی قدسیہ بیگم صاحبہ کے عرس کے مصارف کیلئے مرزا عبداللہ شاہ کو ایک سو پچاس روپیہ دیدئے جائیں تاکہ انتظام میں کسی قسم کی دشواری نہو" (۲۔ اپریل ۱۸۴۱ء)

(۸) "چونکہ بادشاہ سلامت کی طبیعت کسیقدر ناساز تھی اسلئے منجموں کے کہنے کے موافق غلہ۔ گڑ۔ سونا۔ چاندی حضور انور کے جسم کے برابر تول کر فقرا و غربا میں تقسیم کر دیا گیا اور کالے کمبل بھی ضرورت مندوں میں بانٹے گئے" (۳۰۔ اپریل ۱۸۴۱ء)

(۹) "ربیع الاول کی بارھویں تاریخ کو مداری مشرب فقیروں کی ایک جماعت حاضر دربار ہوئی۔ صوفی قادر شاہ کو خلعت سہ پارچہ مرحمت فرمایا گیا اور حکم ہوا کہ ان سب کو انکی مرضی کے موافق کھانا کھلایا جائے" (۱۰۔ مارچ ۱۸۴۸ء)

تعمیرات

تعمیرات سے دلچسپی روپیہ صرف کرنے کا ایک سہل الحصول نسخہ اور شجر فیاضی کی نہایت سایہ دار شاخ ہے۔ بادشاہ کو اس منفعت عامہ کیطرف کافی توجہ تھی۔ قلعۂ معلی میں ہیرا محل کے پاس نہر بہشت[۱] کے کنارے ایک بارہ دری سنگ مرمر کی بنوائی اور حمام شاہی کے عقب میں ایک کنواں تیار کروایا جسپر تاریخ ذیل کندہ ہے:۔

---

[۱] قلعہ میں ہیرا محل اور حمام کے درمیان صحن ہے جسمیں چار گز کے عرض کی "نہر بہشت" جاری تھی۔ اسی نہر کے کنارے بارہ دری تھی جو اب مرزا فخرو کی بارہ دری مشہور ہے ۱۲

ظفر تعمیر شد ایں چاہ شیریں	کہ آبش شربت قند و نبات است
ازیں خوشتر نباشد سال و تاریخ	ہویدا چشمۂ آب حیات است

۱۲۵۷ھ

قلعہ کے باغات "حیات بخش" اور "مہتاب باغ" سدا بہار سبزہ کی رعنائی اور نہروں کی فراوانی سے جنت کا جواب تھے۔ بہادر شاہ نے ایک جھرنا سنگ سرخ کا مہتاب باغ میں اضافہ کیا، اور درگاہ قدم شریف کے حوض میں سنگ سرخ کا جل محل (یا ظفر محل) بنوایا۔ حیات بخش کے مغرب میں باؤلی کے قریب ایک خوبصورت مسجد بنوائی۔ درگاہ آثار شریف کا حجرہ آندھی سے گر گیا تھا بادشاہ نے ۱۸۴۲ء میں از سر نو تعمیر کرایا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پُر انوار پر صندل کا کٹہرا ۱۲۵۳ھ میں نصب کرایا تھا۔ تین سال کے بعد درگاہ کے سامنے ایک نہایت عالیشان اور خوبصورت دروازہ تیار کرایا۔ میر عمارت کو خلعت دو شالہ۔ قبائے کمخواب اور سہ رقم جواہر سے معزز و ممتاز فرمایا۔ محرر تعمیر کو خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر عطا کیا۔ اور زبان فیض ترجمان سے مادۂ تاریخ اسطرح ارشاد فرمایا:-

ایں در عالی چوں شد محکم بنا حسب المراد
گفت دل سال بنا۔ باب ظفر پائندہ باد ۱۲۵۵ھ

درگاہ کے متصل ایک عالیشان محل تیار کرایا جسکے کھنڈر اب تک نوحہ خوانی کر رہے ہیں۔ جھاڑ محل (متصل درگاہ قطب صاحب) کی مرمت خسروانہ اولو العزمی سے کرائی اور جب قطب صاحب حاضر ہوتے اسی میں قیام فرماتے تھے، درحقیقت انھیں کی مرمت کی بدولت یہ محل اسوقت تک قائم ہے۔

بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے حکیم احسن اللہ خاں نے بھی (جنکا تذکرہ آئندہ اوراق میں نذر ناظرین ہوگا) درگاہ کے قریب ایک مسجد اور حویلی بنوائی۔ حویلی پر قطعہ ذیل کندہ ہے۔

از سال بنا نو بدرگاہ	پیر خرم نمود آگاہ
بر داشت سر از دیار دہلی	تعمیر فقیر احسن اللہ

تاریخ مسجد:-

مسجدے ساخت چوں بحسن عمل	احسن اللہ خان پاک سرشت
اے ظفر بہر سال تاریخش	خامہ ام "خانۂ خدا" بنوشت

عیدگاہ شمس الدین التمش کی مرمت ہوئی۔

ظفر چوں بہ ترمیم آخون جی	صفا داد ایں مسجد کہنہ را
بہ پرسید سال مرمت ز عقل	بگفت آفریں نیک مرد خدا

سلیم گڈھ کی عمارات ویران ہو چکی تھیں۔ صرف ایک دو منزلہ دالان اور مختصر سا باغ باقی تھا۔ بادشاہ کبھی کبھی ہوا خوری کو تشریف لیجاتے تھے اور بیگمات وہاں نشانہ بازی کی مشق کیا کرتی تھیں۔ قلعہ کے اُس رُخ پر جو دریا کی جانب ہے بادشاہ نے ایک جدید دروازہ بنوایا جسپر حسب ذیل کتبہ ابتک موجود ہے:-

گشت چوں تعمیر بفضل الہ	ایں در خوش منظر و فرحت فزا
گفت خرد سال بنائش ظفر	باب فلک جاہ و خجستہ بنا

یہ یادداشت اُن کھنڈروں سے مرتب کی گئی۔ جنکے نشان ابھی تک باقی ہیں۔ اُن محلوں اور حویلیوں کی کیا خبر مل سکتی ہے جو غدر کے پُر آشوب فتنہ کا شکار ہوئیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

قلم شکستہ رقم نے فیاضی کی مثالیں نقل کرنے میں کاغذ کے کئی صفحہ سیاہ کئے۔ نکتہ چیں کہتے رہے کہ یہ تفصیل اس موقع پر بیمحل ہے۔ مگر دل نے نہ مانا۔ قابو اس ناسمجھ پہ کس کا ہے۔

سچ یہ ہے کہ ظفر مرحوم کو ازل کی سرکار سے دو نعمتیں ملی تھیں۔ شاعری اور سخاوت لیکن بدنصیبی کا پلّہ ان دونوں سے گراں تر تھا۔ شاعری کا سرمایہ جو دستبرد زمانہ سے بچ رہا تھا۔ صاحب آبحیات نے اپنے استاد کے نذر کر دیا۔ اسکی تفصیل آیندہ اوراق میں نذر ناظرین ہوگی۔ سخاوت جس کی مثالیں تباہی کے بعد بھی دلی کے در و دیوار پر نقش تھیں چرخ نیلوفری کی گردش سے حرص اور طمع کا مرادف قرار پائی !!

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

احوال سلطنت

باز آمدم بر سر داستان۔ بہادر شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی انگریزوں کو اُن وعدوں کیطرف توجہ دلائی جو راجہ رام موہن رائے سے ولایت میں کئے گئے تھے اور اپنے پیشکش میں اضافہ کا دعویٰ کیا۔ بدقسمتی سے اسوقت سر چارلس مٹکاف آگرہ کے لفٹنٹ گورنر تھے اور وہ خاندان مغلیہ کی وجاہت برقرار رکھنے کے مخالف تھے۔ اُنھوں نے اس مطالبہ کی سفارش نہ کی اور گورنر جنرل نے جواب دیدیا کہ وظیفہ مقررہ میں اضافہ اُسوقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ بادشاہ اُن تمام دعووں سے جو وہ برٹش گورنمنٹ پر رکھتے ہوں دست بردار نہو جائیں۔ بہادر شاہ ان شرائط پر راضی نہوئے اور تصفیہ غیر مختتم رہا۔

اس عرصہ میں مرزا مغل بیگ وزیر نے جو علاوہ کم علم اور بے شعور ہونے کے خائن بھی تھے بعض بیش قیمت جواہرات شاہی میں تغلب کیا۔ راز فاش ہوگیا اور قلعہ سے نکالے گئے۔ انکی جگہ پر لکھنؤ کے ایک شریف زادے حامد علی نام قلمدان وزارت سے سرفراز ہوئے۔ اعتماد الدولہ

خان بہادر[1] خطاب ہوا۔ اور قلعۂ معلی میں شرفا کی قدر شناسی ہونے لگی۔ استاد ذوق کی ترقی ہوئی۔ انکا مشاہرہ سو روپیہ مقرر ہوا۔ اور انکے لڑکے خلیفہ محمد اسمٰعیل کو بھی چند خدمتیں سپرد ہوئیں۔

حکیم احسن اللہ خاں کا اختر اقبال عروج[2] پر آیا۔ انکا خاندان ہرات سے آیا تھا۔ اور اکبر ثانی

---

[1] حامد علیخاں کے عہد وزارت کی یادگار ایک مسجد دلی میں اب تک باقی ہے جسمیں قلتین کا حوض ہے اور غالب مرحوم کا قطعۂ ذیل کندہ ہے۔

اعتماد الدولہ کز افراط جود ہست در پیش کفش قلزم غدیر ساخت در دہلی ہمایوں مسجدے

تا شود طاعت گہ برنا و پیر ، شد نظیر کعبہ در عالم پدید سال تعمیرش بود "کعبہ نظیر" ۱۲۵۰ھ

[2] احسن اللہ خاں کے عروج نے بہت سے خاندانی طبیبوں کا بازار سرد کر دیا۔ ان دل شکستہ حکما میں ایک بزرگ حکیم آغا جان عیش تھے۔ جو بقول مولانا محمد حسین آزاد "زیور علم اور لباس کمال سے آراستہ" خوش مزاج شیریں کلام شگفتہ صورت اور نہایت زندہ دل شاعر تھے۔ اُنھوں نے اپنے حریف احسن اللہ خاں کے دست غالب کو ٹھوکیں مارنے کیلئے ایک ہُدہُد تیار کیا۔ ہُدہُد کا نام عبدالرحمن پور ب کے رہنے والے حکیم آغا جان کے ٹر دس میں لڑکے پڑھاتے تھے۔ بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ تیار کرکے دربار میں پہونچے اور منزلت شناس ذرہ نواز بادشاہ نے "طائر الاراکین شہپر الملک ہُدہُد الشعرا۔ منقار جنگ بہادر" خطاب دیا۔ انکا پرلطف کلام "آب حیات" کے دور پنجم میں ملاحظہ کیا جائے۔ یہاں چند اشعار ایک عرضی کے نقل کئے جاتے ہیں جو اُنھوں نے بہادر شاہ کے حضور میں پیش کی تھی۔

جز ترے شاہنشہا کہہ کس کے آگے روئیے	کس سے کہئے جاکے یہ غم کو ہمارے کھوئیے
تجھ کو ہی حق نے کیا ملک سخن کا شہسوار	ہیں بجا کرتے سمند طبع کو۔ یہاں پوئیے
حیف آتا ہے کہ فن شعر میں کیوں کھوئی عمر	کاشکے ہم سیکھتے اس سے بنانے بوئیے
سنگلاخ ایسی زمیں ہے۔ سوچ اے دل تا کجا	فکر کیجئے صرف اسمیں اور پتھر ڈھوئیے
رشتۂ عمر شہنشاہ جہاں ہووے دراز	یا خدا کھلتے رہیں دنیا میں جبتک سوئیے
دیجئے اسکو بغل میں تھوڑی کہ بن گھر گھونسلے	مارتا پھرتا ترا ہُدہُد ہے ٹاٹک ٹوئیے

نے حکیم صاحب کو طبیب شاہی مقرر فرما کے "عمدۃ الملک حاذق الزماں" خطاب دیا تھا۔ اب بہادر شاہ کے مقرب اور مشیر ہوئے" احترام الدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں ثابت جنگ" کے القاب سے یاد کئے جاتے تھے۔ اہل کمال کی قدر افزائی کرتے اور تاریخ و ادب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے خاندان تیموریہ کی تاریخ "مہر نیم روز" اسد اللہ خاں غالب سے لکھوائی اور اس تحفہ کے وسیلہ سے غالب کو دربار شاہی میں رسائی نصیب ہوئی۔ "نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب بہادر نظام جنگ" خطاب ہوا۔ اور ۱۸۵۰ء سے تنخواہ بھی مقرر ہو گئی۔ حکیم صاحب مطبع شاہی کے مہتمم و منصرم تھے۔ بادشاہ کا کلام انھیں کے پاس جمع ہوتا تھا۔ اور جب کوئی دیوان مرتب ہوتا تو انھیں کی نگرانی میں چھپتا تھا۔ انکی نمک حلالی کا افسانہ تو آگے آئیگا۔ اس مقام پر صرف ایک شعر نقل کرنا کافی ہے۔ جو ظفر کے دیوان چہارم میں دشمنوں کی نظر سے محفوظ و مصئون موجود ہے۔

مرے مزاج کے کیونکر نہو خلاف علاج   کہ دشمنوں سے رکھے ہو مرا طبیب اخلاص

(کسی نے سچ کہا ہے:۔

جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکاریگا آستیں کا)

ادھر ادب کا دسترخوان بچھا تھا اور ظرافت و نکتہ سنجی کی مجلسیں گرم تھیں۔ وہاں سرکار کمپنی بہادر کی پالیسی منضبط ہو گئی۔ کہ سلطنت مغلیہ کا ڈھونگ برقرار رکھنا بیکار ہے۔ بادشاہت کا نام قائم رکھنے سے کمپنی پر اخراجات کا فضول بار پڑتا ہے۔ اور لال قلعہ کا عجائب خانہ سیاحان یورپ و ممالک غیر کے شرف ملاحظہ سے محروم رہتا ہے۔ لہذا بادشاہ کو قطب صاحب میں عمارت بنوانے اور وہاں زیادہ وقت صرف کرنے کی رغبت دلائی جانے لگی اور بجائے خود طے کر لیا گیا کہ بہادر شاہ کے بعد انکے جانشین سے قلعہ خالی کرا لیا جائے۔ بہادر شاہ نظر شناس تھے۔ انھوں نے ایک انگریز مسٹر طامسن نام کو سفیر بنا کر انگلستان بھیجا اور اکبر ثانی کی تقلید میں گورنمنٹ ہند کے خلاف ولایت

میں اپیل دائر کرنے کی کوشش کی۔ اس نفیر کی سعی سے یا اُن قدیم وعدوں کے ایفا کیلئے جو راجہ رام موہن رائے سے کئے گئے تھے ۔ اپریل ۱۸۴۵ء میں پچیس ہزار کا اضافہ پیشکش شاہی میں منظور ہوا مگر اسکے ساتھ یہ شرط لگادی گئی کہ کوٹ قاسم کا پرگنہ اور شمع پور وغیرہ دیہات جو ہنوز تولیت شاہی میں تھے رزیڈنٹ کے سپرد کر دئے جائیں یعنی قلعہ کے باہر ایک گز زمین بھی شاہی انتظام میں نہ رہے ۔

اضافہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دلی کے بڑے صاحب نے حکم جاری کیا کہ تمام ہندوستانی[1] امرا کو اطلاع دیجائے کہ جب ہاتھی پر سوار ہو کر بازار میں نکلیں اور سامنے سے کسی انگریز کی سواری آتی ملے تو اپنے ہاتھیوں کو بالکل کنارے کر لیا کریں تاکہ آنے جانے میں مزاحمت نہو

اتفاق سے اسی زمانہ میں شہر دہلی کے چند باغات کی بابتہ مرزا سلیم مرحوم کی بیوی نواب سینی بیگم اور بہادر شاہ میں نزاع ہوئی ۔ ملازمین شاہی نے ان باغات پر قبضہ کر لیا بیگم نے عدالت دیوانی میں استغاثہ کیا کہ یہ باغات انکے شوہر نے مہر کے بدلے میں دئے تھے ۔ اور کارپردازان سلطنت کو اُنپر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ جج صاحب نے حکم دیا کہ یہ مقامات قلعہ سے باہر ہیں اور بادشاہ سلامت کو اُن کے متعلق کسی قسم کی کارروائی کا استحقاق نہیں ہے اگر ملازمان شاہی انھیں اپنے قبضہ تصرف میں لینا چاہتے ہیں تو عدالت دیوانی میں دعوی کرنا چاہئے ۔

بادشاہ کے نوکروں نے لفٹنٹ گورنر آگرہ کے پاس درخواست بھیجی اور اس بات پر زور دیا کہ جج صاحب کو شاہی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی منصب نہیں ہے انھیں اس قسم کی کارروائی سے منع کرایا جائے مگر وہاں تو مدنظر کچھ اور ہی تھا۔ آگرہ کی عدالت سے بادشاہ کے خلاف فیصلہ ہوا۔ اور طے کر دیا گیا کہ قلعہ کے باہر بادشاہ کو کسی قسم کا استحقاق نہیں ہے ۔غرض دلی کے باشندوں کو یہ امر بخوبی ذہن نشین کرا دیا گیا کہ دارالسلطنت پر بادشاہ کی ملکیت باقی نہیں رہے

[1] احسن الاخبار بمبئی ۔ ۲۰ مئی ۱۸۴۶ء

اور سرکار کمپنی بہادر نے اُنکے تمام اختیارات سلب کر لئے ہیں۔ اس زمانہ میں بادشاہ کے دل پر جو غم و افسردگی کا ہجوم تھا وہ اُنکے کلیات سے جگہ جگہ ظاہر ہوتا ہے۔

ظفر شعر و سخن سے راز دل کیونکر نہ ظاہر ہو
کہ یہ مضمون سارے دل کے اندر سے نکلتے ہیں،

اس عہد کے کلام میں دوستوں کی بیوفائی اور بدعہدی کا سخت شکوہ اور گلہ ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

ملتے ہیں ہمسے یہ ہیں دل سے عداوت رکھتے (۱) جانتے ہم تو نہ ایسوں سے محبت رکھتے
ارادہ اور ہی کچھ دلمیں لانا بزباں کچھ ہے (۲) کریں کیا اعتبار اُسکا عیاں کچھ ہی نہاں کچھ ہے
نہ تنگ کیوں ہمیں صیاد یوں قفس میں کرے (۳) خدا کسیکو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے
کیا جو تمنے میرے ساتھ اپنے دلسے وہ پوچھو (۴) مجھے بس چپ ہی تم رہنے دو کہلواتے زباں کیوں ہو
میں خوب جانتا ہوں نامعتبر ہیں بالکل (۵) تم لاکھ عہد نامے قول و قسم سے لکھو
جبتک کہ صاف تھے تم تھیں صاف صاف باتیں (۶) اب دل ہی پر کدورت سب ہیں خلاف باتیں
اب جو لکھتا ہے وہ یہ کا ہیکو لکھتا تھا کبھی (۷) دیکھ لو اُس بت بے پیر کا یہ بھلا کاغذ
جنھوں نے رنگ مری عز و شان کا بدلا (۸) ہے ایک ایک سے لینا جہان کا بدلا
پا سکے رمز و کنایہ کوئی کیا اُسکے ظفر (۹) جسکی اک بات میں سو طرح کا پہلو نکلے
نہ ہم راہ وفا بھولے نہ تم طرز ستم چوکے (۱۰) جو اپنی بات تھی اُس سے نہ تم چوکے نہ ہم چوکے
وہ کھا گئے سو بار مرے آگے قسم جھوٹھ (۱۱) اور پھر ہے یہ دعویٰ کہ نہیں بولتے ہم جھوٹھ
نہ کر بدعہدیاں پیمان شکن انصاف کر دل میں (۱۲) کئے تھے تو نے میرے ساتھ کیا قول و قسم پہلے
تمھاری بات کا کیا کوئی اعتبار کرے (۱۳) کہ قول دے کے کئی بار تم ظفر سے پھرے
عہد و پیمان تھے مرے ساتھ تمہارے کیا کیا (۱۴) ہو گیا کیا کہ جو سب تم کو فراموش ہوئے

اس پراگندہ دلی کے وقت دو غمخوار ہستیاں بادشاہ کی بے لطف زندگی کا سہارا تھیں - اول تو نواب زینت محل جنپر بادشاہ ہزار جان سے عاشق تھے۔ تمام بیگمات سے زیادہ ان کی عزت و منزلت تھی۔ بادشاہ کی سواری گاڑی میں سولہ گھوڑے لگائے جاتے تھے اور انکی بگھی میں آٹھ۔ حالانکہ کسی دوسرے رئیس کو چوکڑی سے زیادہ کی اجازت نہ تھی -

حامد علیخاں وزیر سلطنت رخصت لیکر لکھنؤ گئے تو بیگم نے قلعہ کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لیلیا۔ خواجہ سرا محبوب علیخاں کی معرفت مختاری کے فرائض انجام دیتیں۔ بخشی گری کی تنخواہیں اپنے روبرو تقسیم کراتیں۔ رزیڈنٹ سے پس پردہ بیٹھ کر کلمہ و کلام کرتی تھیں۔ کارپردازان سلطنت کے نام احکام جاری ہو گئے تھے کہ جس دستاویز پر نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی مہر نہو وہ غیر معتبر ہے۔ ایک مرتبہ بیمار ہوئیں تو نواب فرخ آباد کے طبیب خاص حکیم امام الدین خاں گورنر جنرل کی وساطت سے اُنکے علاج کیلئے طلب کئے گئے اور جب تک بیگم صاحبہ کا مزاج اقدس روبصحت نہوا شاہی مہمان رکھے گئے۔ اُنھوں نے ایک مکان شہر میں خرید کرنا چاہا تو جان نثار شوہر نے ارشاد فرمایا -

کہتا ہے کون مول مکاں مہ جبین نہ لو   پر جب تلک نہو مرے گھر کے قریں نہ لو

اور لال کنوئیں پر حویلی بنوائی تو بادشاہ نے دست خاص سے حسب ذیل تاریخ رقم کی جو اسوقت تک محل کے دروازہ پر موجود ہے -

کرد اسے ظفر زینت محل تعمیر قصر بے بدل   شد بر محل سال بنا "ایں خانۂ زینت محل"

سنہ ۱۲۶۲ھ

آزاد نے نہایت خندہ پیشانی سے یہ تاریخ ایک دلچسپ حکایت کے ضمن میں استاد ذوق کے نذر کر دی ہے۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز !!)

نواب حامد علیخاں وطن سے واپس آئے تو منصب مختاری دوبارہ حاصل کرنے کے لئے

ملکہ دوران کی خوشامد کی۔ اُنکے فرزند شہزادہ جواں بخت کو ایک سوتا بنے کے کھلونے اور کپڑے نذر کئے۔ پندرہ ہزار روپیہ بطور نذرانہ اور پانچ اشرفی شکرانہ بادشاہ سلامت کی خدمت بابرکت میں پیش کرکے اپنے عہدے پر بحال ہوئے لیکن انتظامات بدستور ملکۂ عالم کے قبضۂ قدرت میں رہے۔ اور وزیر السلطنت بادشاہ کے مختار نہیں بلکہ نواب زینت محل کے کارپرداز تھے

مرزا دارا بخت اور مرزا شاہ رخ

ولیعہد بادشاہ کے خلف اکبر مرزا دارا بخت تھے۔ ذکیتہ النساء بیگم بنت مرزا سلیمان شکوہ (برادر اکبر ثانی) کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اُنکی بابت زمانہ حال میں تذکرہ خمخانہ جاوید نے شہرت دی کہ وہ مولانا فخر الدین چشتی کے خلیفہ تھے اور اپنے باپ سے صرف بارہ۱۲ برس چھوٹے تھے لیکن یہ افسانہ بے بنیاد ہے۔ حضرت فخر دہلوی کی وفات کے وقت بہادر شاہ دس برس کے تھے۔ اور دارا کو تو انکے صاحبزادہ حضرت قطب الدین کی بھی زیارت نہیں ہوئی۔

احسن الاخبار بمبئی مورخہ ۲۶ فروری ۱۸۴۱ء کا نامہ نگار رقمطراز ہے کہ "مرشدزادہ آفاق مرزا ولیعہد بہادر کی پچپنویں سالگرہ کی تقریب کے موقع پر بادشاہ سلامت نے انہیں دو اشرفیاں مرحمت فرمائیں"۔ بہادر شاہ اسوقت قمری حساب سے ۶۳، یا ۶۴، برس کے تھے۔ لہذا باپ بیٹے کے درمیان صرف بارہ برس کا نہیں بلکہ اٹھارہ برس کا فرق سمجھنا چاہیئے۔ اور اس لحاظ سے دارا بخت کا سنہ ولادت غالباً ۱۷۹۳ء یا ۱۷۹۴ء تھا۔

بہرحال ولیعہد نواب زینت محل کے "نورجہاں" بننے سے خوش نہ تھے اور اُن کی چاپلوسی نہ کرتے تھے۔ بہادر شاہ بیگم کے بس میں تھے اسلئے بڑے بیٹے سے ناراض رہتے اور اپنے دوسرے لخت جگر مرزا شاہ رُخ کو چاہتے تھے، جو ولیعہد سے چھوٹے اور دوسرے مرشدزادوں سے بڑے تھے۔ وہ سب شہزادوں سے زیادہ قابل۔ دانشمند۔ جفاکش اور ہونہار تھے

نشانہ باز ایسے زبردست تھے کہ استاد ذوق نے اُنکی تعریف میں کہا تھا:۔

ہاتھ میں بندوق لے جسوقت تو بہرِ شکار — شیرِ گردوں کو ہو مشکل ہاتھ سے تیری نجات

تا نسر طائر ایک پرندہ نہ بچ سکے — منظور تجھکو جبکہ شکار پرندہ ہو

سعادتمندی سے والد ماجد کی اطاعت فرض سمجھتے اور کسی طرح اُنکے خاطر مبارک پر اپنی طرف سے غبار نہ آنے دیتے تھے۔ نواب زینت محل کی عزت و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے اور موقع موقع سے اُنکے فرزند جواں بخت کی بھی خاطر کرتے تھے۔ ملکۂ دوران کی خوشنودی مزاج کا ثمرہ تھا کہ بعض خدمات سلطانی اُنکے سپرد تھیں اور تمام اراکین دربار اُنکی عزت ولیعہد سے بہت زیادہ کرتے تھے۔ دولتمندی میں اپنے سب بھائیوں سے فائق تھے اور اسکا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ایکبار[1] اُنکے مکان کی دیوار گر پڑی۔ باہر سے اندر کا سارا حصہ نظر آنے لگا تو دیکھا گیا کہ کلابتوں سے بھرے ہوئے دو صندوق۔ اشرفیوں کا ایک دیگچہ اور روپیوں کا ایک دیگچہ باہر نکل کر گر پڑے ہیں"۔ اُن کو شکار کا بہت شوق تھا۔ اور نجیب آباد۔ سہارنپور۔ کاشی پور تک صید افگنی کے لئے جایا کرتے تھے۔ ایکبار شکار سے واپس آئے تو حکم سلطانی کے بموجب مرزا جواں بخت اُنکے استقبال کیلئے غازی آباد تک بھیجے گئے۔ اداشناس شاہ رخ نے چھوٹے بھائی کو خلعت سہ پارچہ و سہ رقم جواہر اور سپر و تلوار سے شاد کام کیا۔ ثمریہ ملا کہ قلعۂ معلی میں پہونچے تو بادشاہی توپخانہ سے سترہ توپوں کی سلامی سر ہوئی۔ نواب حامد علیخاں بہادر نے ایک اشرفی نذر کی اور بادشاہ سلامت نے ایک دستار سربستہ طرۂ مقیش کے گوشوارہ کے ساتھ۔ ایک دوشالہ۔ ایک کمخواب کی قبا سہ رقم جواہر۔ ایک سپر۔ ایک شمشیر شہزادے کو اور ۲۴ خلعت اُنکے ہمراہیوں کو مرحمت فرمائے۔ اس انعام کا اُن دو اشرفیوں سے مقابلہ کیجئے جو مرزا ولیعہد کو سالگرہ کے موقع پر عنایت ہوئی تھیں۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

استاد ذوق ایسے مبارک موقع پر کیونکر خاموش رہتے۔ شہزادہ کو "ثانی رستم" قرار دیا

[1] احسن الاخبار بمبئی ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۵ء

اور قطعۂ ذیل نذر گزرانا۔

میرزا شاہ رُخ بہادر نے	قصد صید افگنی کیا جسدم
خون نخچیر سے ہوا سارا	دامن دشت لالہ زار ارم
نہ بچا اُس شکار افگن سے	صید کوئی سوائے صید حرم
مرغ و سیمرغ اور غزال و پلنگ	ہوئے مسکن پذیر دشت عدم
ہے جگر گوشۂ بہادر شاہ	ہو بہادر نہ کیوں وہ نیک شیم
ہاتھ میں جب تفنگ لی اُسنے	ہمسر اژدہائے آتشدم
کئے شیر نریاں شکار کئی	اس غضنفر شکار نے پیہم
ہے بجا گر دلاوران جہاں	کھائیں اسکی دلاوری کی قسم
جبکہ اس جرأت و شجاعت کو	چاہا اسطرح دل نے کیجئے رقم
تا رہے یادگار عالم میں	وصف عالی صاحب عالم
لکھی اے ذوقؔ میں نے یہ توصیف	مع تاریخ "ثانی رستم"

سنہ ۱۲۶۲ھ

اگرچہ بہادر شاہ نے مرزا دارا بخت کو منصب ولیعہدی سے معزول کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن ملازمان کمپنی کو شاہ رخ کی غیر معمولی عزت و تکریم ناگوار تھی۔ ایک مرتبہ صاحب عالم نے" ایک قطعہ ماہی شکار صاحب کلاں بہادر کی خدمت میں بھیجا۔ صاحب نے اسے واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ حضور انور یا حضرت مرزا ولیعہد بہادر کے عطیہ کے سوا اور عطیہ قبول نہیں کیا جاویگا۔"

ولیعہد خود تو بڈھے باپ کی اطاعت گذاری نہ کرتے تھے اور شاہ رخ سے بیزار رہتے تھے جنھوں نے اپنا نصب العین بادشاہ کی خوشی کو قرار دے رکھا تھا جسقدر شاہ رُخ کا عروج

بڑھتا جاتا تھا اُتنا ہی ولیعہد کی کشیدگی اپنے والد سے زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ مرزا شاہ رخ
فتنہ وفساد سے بچنے کیلئے زیادہ وقت سیر وشکار میں صرف کرتے اور قلعہ سے دُور دُور
رہتے تھے ۱۸۴۷ء کے آغاز میں ایک سو سپاہی، بارہ ہاتھی۔ دس سوار اور دو توپیں ساتھ لیکر
رامپور بریلی کیطرف شکار کھیلنے کی غرض سے تشریف لیگئے اور جس ہفتہ میں کہ ولیعہد کو بتقریب
سالگرہ دو اشرفیاں بادشاہ نے مرحمت کیں انکے خرچ شکار کیلئے چھ ہزار روپیہ روانہ فرمایا۔
والد ماجد سے رخصت ہونے کے دو ہی ہفتہ بعد انکا ایک عریضہ ہاپوڑ سے آیا کہ مجھے مرض
بواسیر لاحق ہوگیا ہے اور اسکی وجہ سے طرح طرح کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ بادشاہ سلامت
نے اسکے جواب میں شقہ روانہ کیا کہ "میں دست بدعا ہوں کہ ایزد کریم تمھیں شفائے کامل عاجل
عطا فرمائے" اور چند روز کے بعد تین ہزار روپیہ خرچ کیلئے پھر روانہ فرمایا۔ اور لکھا کہ بہت
جلد شرف حضوری حاصل کرو۔ مگر باپ کی بدنصیبی سے بہار کی زہریلی ہوا اپنا کام کرچکی تھی۔
شکار کی دوڑ دھوپ نے کسلمندی اور بڑھائی۔ دلی پہونچتے پہونچتے اپریل ۱۸۴۷ء میں اس
ہونہار شہزادہ کا خاتمہ ہوگیا۔

"حضرت ولیعہد بہادر۔ تمام اولاد امجاد اور سلاطین قلعہ شہزادہ کی فاتحہ خوانی کیلئے
مسجد جامع میں جمع ہوئے۔ فاتحہ خوانی اور ختم کلام اللہ کی محفل ہوئی۔ حضور والا نے اپنی
زبان مبارک سے مرشد زادۂ خلد آشیاں کے متعلقین سے مخاطب ہوکر کلمات صبر وتسکین ارشاد
فرمائے اور کہا کہ "حکم الٰہی میں کسکا چارہ ہے۔ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔
کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام" اسکے بعد حضور والا نے
تعزیت کے طور پر خلعتہائے فاخرہ۔ کمخواب کی قبا۔ دستار۔ کانوں کے مرصع بُندے۔ دوشالے
صاحبزادیوں اور صاحبزادوں کو مرحمت فرمائے۔ اور ارشاد کیا کہ عدت کے گزرنے کے بعد مرحوم
کی بیگم صاحبہ کو بھی معمول کے موافق خلعت دیا جائیگا"۔

دو تین روز کے بعد مرزا مرحوم کے بڑے صاحبزادہ کو طلب فرما کر بادشاہ نے سواروں کی بخشی گیری کا منصب اور علاقہ جات پدری اور کمخواب کی قبا۔ سہ رقم جواہر۔ دوشالہ۔ دستار سربند سپر شمشیر۔ گھوڑا۔ ہاتھی مرحمت فرمایا۔ اور "قرۂ باصرۂ خلافت۔ غرہ ناصیۂ دولت۔ شیر بیشۂ شہامت شہسوار میدان شجاعت غضنفر الدولہ شمس الممالک مغیث الزماں مرزا محمد عبد اللہ شاہ کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

منجھلے صاحبزادہ کو بھی تمام کارخانوں کا دیوان مقرر فرماکر "نور حدیقۂ شہریاری نور دیدۂ کامگاری مہر سپہر رفعت۔ ماہ منیر دولت۔ رفیع الدولہ قطب الممالک۔ فخر الزماں مرزا محمد مظفر بخت بہادر" کے خطاب سے معزز فرمایا۔ اور ایک کمخواب کی قبا۔ دوشالہ۔ سہ رقم جواہر دستار۔ گھوڑا۔ ہاتھی۔ پالکی وسامان مرحمت ہوا۔

اور سب سے چھوٹے صاحبزادہ کو سپاہیوں کی پلٹن کی بخشی گیری کے عہدہ پر مقرر کیا ایک کمخواب کی قبا۔ دوشالہ۔ سہ رقم جواہر۔ دستار۔ سپر۔ تلوار۔ ہاتھی۔ گھوڑا۔ پالکی مرحمت فرمائی۔ اور "گوہر درج خلافت۔ اختر برج سلطنت۔ یکہ تاز میدان شجاعت۔ نہنگ دریائے شہامت۔ مغیث الدولہ۔ فخر الممالک۔ محی الزماں۔ مرزا محمد خرم بخت بہادر" کے خطاب سے سربلند فرمایا شہزادے کے متوسلین میں سے کنور سالک رام کو امین بخشی گیری کا عہدہ اور خلعت شش پارچہ وسہ رقم جواہر فخر الممالک بہادر کے پیشکار راجی داس کو خلعت چہار پارچہ وسہ رقم جواہر قطب الممالک کی مختاری کا عہدہ مرحمت ہوا۔ گوبند پرشاد کو مرزا شمس الممالک کی پیشکاری کے عہدے کی تقریب میں خلعت سہ پارچہ۔ اور دو رقم جواہر سے معزز فرمایا۔

صاحب کلاں بہادر کے نام رقعہ جاری فرمایا کہ موضع تانہ جو شاہزادہ شاہرخ مرحوم کی ملکیت میں تھا شہزادے کی وفات کے بعد ہمنے انکی اولاد کو مرحمت فرمایا۔ اسکا باقاعدہ اندراج ہونا چاہیئے۔ تاکہ کسی قسم کی غلطی واقع نہو۔ [1]

[1] احسن الاخبار ۱۸۴۶ء

بادشاہ کو اس لائق اور قابل بیٹے کی وفات کا سخت قلق ہوا۔ اولاد کا داغ پہلے بھی برداشت کر چکے تھے اور ایک کمسن شہزادے مرزا بلاقی نام کی موت پر جو صرف گیارہ بارہ برس کے سن میں دنیا سے سدھارے بڑے درد سے کہا تھا۔

گل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے
وہ کیا کریں کہ غنچہ ہی کھلا کے جھڑ پڑے

(اور اسی مضمون کو استاد ذوق نے ترقی دیکر اپنا کمال دکھا دیا تھا۔

گل بھلا کچھ تو بہاریں اے صبا دکھلا گئے | حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے)

لیکن مرزا شاہ رُخ کی جوانا مرگی نے ضعیف العمر باپ کی کمر توڑ دی اور حسرت نصیب بادشاہ کو غم و الم کی تصویر بنا دیا۔

یہ نقشہ ہو گیا ہے میرا سودائے محبت میں | مری صورت مرے یاروں سے پہچانی نہیں جاتی
چھوڑ کر یار ہیں سب ہوئے چلتے پھرتے | اپنی تنہائی پہ ہم ہاتھ ہیں ملتے پھرتے
صبح رو رو کے شام ہوتی ہے | شب تڑپ کر تمام ہوتی ہے
طاقت و ہوش ہوئے ہم سے جدا اچھے وقت | دی بڑھاپے میں ہمیں سب نے دغا اچھے وقت

قطعہ

غافل ہو کہ نہ ہو تم کو سفر میں کچھ سود | ساعت نیک منجم سے مگر پوچھتے ہو
ایک جب جاتے ہو دنیا سے سوئے ملک عدم | نہ کوئی دن نہ کوئی وقت سفر پوچھتے ہو

ولیعہدی کا قضیۂ نامرضیہ

مرزا شاہ رُخ مرحوم سے دائمی مفارقت کے بعد بادشاہ کی تسلی و تشفی کا وسیلہ صرف نواب زینت محل تھیں یا انکے لاڈلے فرزند مرزا جواں بخت بیگم کو آرزو پیدا ہوئی کہ انکا نور نظر

ولی عہد سلطنت قرار دیا جائے۔ بادشاہ بھی ہم خیال ہوگئے۔ قریب تھا کہ خلف اکبر کو اس منصب سے معزول کرانے کی علی الاعلان کوشش کیجائے کہ ۱۱۔جنوری ۱۸۴۹ء کو مرزا دارا بخت دنیا سے رخصت ہوگئے اور خانہ جنگی کے لئے میدان صاف ہوگیا۔ بادشاہ نے مرزا جواں بخت کو ولیعہد بنانا چاہا اور کمپنی بہادر کے ملازمین کو اپنی طے شدہ پالیسی ظاہر کرنے اور لال قلعہ کو خاندان تیموریہ سے خالی کرانے کا وعدہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو بادشاہ کی زندہ اولاد میں سب سے بڑے تھے اور انگلستان کے قانون وراثت کے مطابق منصب ولیعہدی اُنھیں کا حق تھا۔ مرزا جواں بخت کئی مرشدزادوں سے چھوٹے تھے اور بادشاہ اُن کی نامزدگی پر مصر تھے۔ انجام یہ ہوا کہ مرزا فخرو نے ولیعہدی کی طمع میں کمپنی کے پیش کردہ شرائط قبول کرلئے۔ انگریزوں نے اُنکو ولیعہد مقرر کردیا۔ اور زینت محل منھ دیکھتی رہ گئیں۔

اسوقت لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل تھے جن کا عہد حکومت ہندوستان کی تاریخ میں دیسی ریاستوں کے الحاق کی وجہ سے یادگار رہے۔ بادشاہ کی نذر جو گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے سالگرہ مبارک اور نوروز وغیرہ جشنوں کے موقع پر پیش کیجاتی تھی ۱۸۴۳ء سے لارڈ ایلنبرا نے بند کردی تھی۔ جو انگریز آخری مرتبہ یہ نذرانہ پیش کرنے گیا تھا اُسکا بیان ہے کہ "میں نے جسوقت دربار میں قدم رکھا تو مجھ پر عجیب قسم کی ہیبت طاری ہوگئی تھی" نئے گورنر جنرل کو اس رسم کی اطلاع نہ تھی جب خبر ملی تو وہ نہایت متعجب ہوئے اور ہمیشہ کیلئے اس دستور کو موقوف کردیا۔ فرمانروائے دہلی کا نام سکہ پر نقش ہوتا تھا وہ ۱۸۳۵ء سے بند ہوا۔ گورنر جنرل کی مہر سے "فدوی خاص بادشاہ" کے الفاظ خارج کئے گئے اور ہندوستانی رئیسوں کو ہدایت کیگئی کہ وہ بھی اپنی اپنی مہروں سے بادشاہ کی نسبت اس قسم کے بے معنی الفاظ خارج کردیں۔ قلعہ کے آیندہ انتظام کیلئے ایک کمیٹی نامزد ہوئی جسمیں ولیعہد جدید بھی شامل تھے۔ اور یہ تجویز پاس ہوئی کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد مرزا فخرو برائے نام بادشاہ ہوں لیکن قلعہ خالی کردیں اور

قطب صاحب میں جاکر رہیں۔

زینت محل کو زک دینے کیلئے ولیعہد نے یہ شرطیں منظور کرلیں اور ۱۸۵۲ء میں ایک معاہدہ دستخط و مہر سے مکمل ہوگیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے مرزا فخرو کو باضابطہ ولیعہد بنادیا۔ لیکن زینت محل اپنی ترکیبوں سے غافل نہ تھیں۔ جائز و ناجائز۔ ظاہر و پوشیدہ۔ ہر قسم کی کوششیں اپنے فرزند کو تاجدار بے ملک بنانے کی کرتی رہتی تھیں۔ کبھی رزیڈنٹ کی خوشامد کرتیں۔ کبھی انگریزوں کو دھمکیاں دیتیں، علوی سفلی ہر قسم کے اعمال۔ ٹونے ٹوٹکے برابر ہوتے رہتے تھے (حتیٰ کہ ۳ نومبر ۱۸۵۳ء کو سر ٹامس مٹکاف رزیڈنٹ دفعتًا مر گئے اور علامات مرگ نباتاتی زہر سے مسموم ہونے کی دیکھی گئیں تو عوام نے شبہ کیا کہ یہ بھی زینت محل کی کارسازی تھی !!) پارٹی بازی کا بازار گرم تھا۔ مرزا فخرو اور مرزا جواں بخت کی جُدا جُدا ٹولیاں تھیں۔ شہزادوں کے حرکات بادشاہ کیلئے سوہان روح تھے۔ اور ایک معتبر راوی کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے "میری اولاد ناحق آرزو سلطنت کی رکھتی ہے۔ یہ کارخانہ آگے کو چلنے والا نہیں ہے مجھ ہی پر خاتمہ ہے"۔ "از تیمور تا ظفر"۔ راوی[۵] کا بیان ہے کہ یہ قول حضرت کا تکیہ کلام ہوگیا تھا۔

اس عرصہ میں ایک نیا گل کھلا یعنی دو تیموری شہزادے مرزا حیدر شکوہ اور مرزا نور الدین (عرف مرزا مراد) پسران مرزا کام بخش ابن شہزادہ سلیمان شکوہ جو دادا کے وقت سے لکھنؤ میں آباد تھے سرکار اودھ سے ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ پاتے تھے اور مذہب سلطنت کے حلقہ بگوش تھے وطن آبائی کی زیارت کیلئے ۱۸۵۱ء میں دہلی تشریف لائے۔ ان شہزادوں کی کارگزاری بیان کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ انکے جدامجد کا تعارف کرایا جائے۔

۵؎ ظہیر دہلوی۔ "صاحب داستان غدر" ۱۲

مرزا سلیمان شکوہ

مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم کا اسم گرامی اس بد اقبالی کی شب تار میں جگنو کیطرح چمکتا ہے۔ جب تک انشا، مصحفی، سوز و جرأت کا نام زندہ ہے اس علم دوست شہزادے کی ہنر پروری بھی یاد رہیگی۔

یہ عالی ہمت شہزادہ ۱۲۰۵ھ میں وطن مالوف سے ہجرت کر کے لکھنؤ پہونچا۔ وہاں نواب وزیر اور مرزا جواں بخت ولیعہد شاہ عالم سے بے لطفی ہو چکی تھی جسکا قصہ پہلے نذر ناظرین ہو چکا ہے اسلئے حفظ ما تقدم کے طور پر تین مہینہ تک نواب اودھ اپنے ولی نعمت کے استقبال کو نہ گئے مرزا بھی خود دار تھے۔ پانچہزار سوار و پیدل و شاگرد پیشہ کی جمعیت سے لکھنؤ سے تین کوس پر ڈیرے ڈالے پڑے رہے۔ مگر شہر کے اندر قدم نہ رکھا۔ آخر کار گورنر جنرل کی تحریک سے نواب وزیر استقبال کو نکلے اور شہزادے کو ہاتھی پر سوار کر کے خود خواصی میں چنور لیکر بیٹھے اور نہایت تجمل کے ساتھ شہر میں لائے۔ چھ ہزار روپیہ ماہوار جیب خرچ کیلئے بطور پیشکش کے مقرر ہوا اور نواب وزیر فدویانہ سلوک کرتے رہے۔ مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ ایک ایک الایچی اور گلوری کی بخشش پر آداب گاہ جا کر بار بار مجرا بجالاتے تھے۔ نواب غازی الدین حیدر نے لارڈ ماٸرا کے زمانہ میں گورنمنٹ انگریزی کے اشارہ سے خطاب بادشاہی قبول کیا تو انکی خواہش ہوئی کہ مرزا سلیمان شکوہ مساویانہ حیثیت سے ملاقات کریں۔ رزیڈنٹ لکھنؤ نے شاہزادہ سے کہلا بھیجا کہ ابتک نواب وزیر تھے وہ بآداب وزارت حاضر ہو کر نذر دیا کرتے تھے۔ اور خلعت پہنتے تھے۔ اب بحکم انگریزی گورنمنٹ وہ بادشاہ ہو گئے ہیں۔ لہذا اُنسے حضور مساویانہ حیثیت سے ملیں۔ شاہزادہ نے کہلا بھیجا کہ بہتر ہے میں ملاقات کرونگا تو اسیطرح کرونگا۔ پھر رزیڈنٹ نے کہلا بھیجا کہ کل بادشاہ اور فدوی ملنے کو آئینگے۔ ملاقات کے وقت اسکا لحاظ رکھا جائے

دوسرے روز صبح کو بادشاہ اور رزیڈنٹ مع امرا و ارکان دولت شہزادہ کے جلو خانہ میں تشریف لائے۔ نواب ناظر نے چلمن اُٹھائی اور حسب دستور آواز دی "اہل دربار خبردار ہو جاؤ حضور برآمد ہوتے ہیں" شاہ اودھ نے موافق اپنے عادات قدیم کے ذرا خم ہو کر سلام کیا۔ اُدھر چوبدار نے آواز دی "صاحب عالم و عالم پناہ سلامت" شاہزادہ نے سلام کا جواب بطریقہ اسلام دیا۔ دہنے ہاتھ میں شاہ اودھ کا ہاتھ۔ بائیں میں رزیڈنٹ کا ہاتھ لیکر دیوان خاص میں ایک دنگل پر اپنے پاس شاہ اودھ کو بٹھالیا۔ ایک لمحہ کے بعد فرمایا۔ کہ سرکار کمپنی کی خوشی ہو گئی میری بیوی، "ممتاز محل" قریب مرگ ہے۔ میں اُسکو سکرات میں چھوڑ آیا ہوں اسوقت فرصت نہیں ہے پھر ملاقات ہو گی۔ یہ کہکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

کشتیاں آئیں۔ شاہ اودھ نے ایک شالی رومال اُٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا مگر دل میں بہت کبیدہ ہوئے۔ اُسدن سے پھر نصیر الدین حیدر کی شادی تک ملاقات نہوئی۔ بادشاہ کو یہ دُھن تھی کہ میں بادشاہ ہوا ہوں تو میرے بیٹے کی شادی تیموریہ خاندان میں ہونا چاہیئے جوڑ توڑ لگا کر شاہزادے کے مصاحبوں کو ہموار کر کے نصیر الدین حیدر کی شادی مرزا سلیمان شکوہ کی بیٹی سے کر لی۔ چھ ہزار پہلے سے تھے ایکہزار روپیہ ماہوار شادی کیوقت اور پانچہزار مسادیانہ ملاقات کے وقت جملہ بارہ ہزار ماہانہ پیشکش مقرر ہو گیا۔ جب نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور اُنھوں نے ہاتھ پاؤں نکالے تو ایک لڑکی پر ڈورے ڈالے جسکو شہزادی بیگم نے پرورش کیا تھا اور اُسکا نام "قمر چہرہ" تھا۔ پہلے تو گفت و شنید رہی اسکے بعد کٹنی کو بھیج محل سے اُڑوالیا۔ شاہزادہ کو سخت ناگوار ہوا۔ رزیڈنٹ تک بات پہونچی اُسنے بادشاہ کو سمجھا بجھا کر "قمر چہرہ" کو واپس کروایا۔ گر شاہزادے ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ کرنل کارن رئیس کاسگنج کو بلوا بھیجا۔ اُسکی پوتی شاہزادہ کے بیٹے سے منسوب تھی۔ اُسی کے ساتھ کاسگنج چلے گئے۔ پانچہزار روپیہ جو غازی الدین حیدر نے بوقت ملاقات مسادیانہ مقرر کئے تھے وہ بند ہو کر سات ہزار میں سے ایک ہزار خزانہ شاہی سے اور

چھ ہزار بتوسط رزیڈنٹ شاہزادہ کو ملتے رہے۔ وہاں یہ گل کھلا کہ کرنل صاحب کے بیٹے قمر چہرہ کو لے اُڑے اور الور جاکر عیش کرنے لگے۔ اِس سے شاہزادہ وہاں سے بھی دل برداشتہ ہوگئے اور اکبرآباد جاکر بود و باش اختیار کی۔ آخرکار ماہ ذیقعدہ ۱۲۵۳ھ میں اس عالم کے کشاکش سے نجات پاکر سکندرہ مقبرۂ اکبر میں مدفون ہوئے۔

مرزا سلیمان شکوہ کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سے بڑے بیٹے مظفر بخت ایک مرتبہ الوالعزمی سے تسخیر ممالک کیلئے راجپوتانہ کی طرف گئے۔ قاضی محمد صادق خاں اختر اور بہت سے شرفا لکھنؤ ساتھ تھے۔ بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی صورت کامیابی کی نظر نہ آئی۔ کئی برس کی سرگردانی کے بعد واپس آئے اور خانہ نشین ہوگئے۔ مرزا سلیمان شکوہ نے سو روپیہ ماہوار اُن کے جیب خرچ کیلئے مقرر کردئے۔ دوسرے بیٹے شہزادہ کے مرزا کام بخش تھے۔ مدت العمر اپنے والد ماجد کے کاروبار کے مہتمم رہے۔ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ خاک پاک لکھنؤ کے اثر سے مذہب اثنا عشریہ اختیار کرلیا تھا۔ مرنے کے بعد آغا باقر کے مشہور امام باڑے میں دفن ہوئے۔ انہیں سب سے بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ اُنکے دو بیٹے مشرف بزیارت کربلائے معلّٰی ہوئے۔ اور طہران پہونچکر شاہ کجکلاہ کے عرصہ تک مہمان رہے۔ اُنکے بڑے بیٹے مرزا حیدر شکوہ مع دیگر اعزہ کے اپنے والد کی وفات کے بعد اکبرآباد سے لکھنؤ آئے۔ رزیڈنٹ کی سفارش سے ہزار روپیہ ماہوار سرکار اودھ سے مقرر ہوئے۔ اسمیں سے چھ سو مرزا حیدر شکوہ لیتے تھے اور چار سو دوسرے متعلقین کو تقسیم کردیتے تھے۔ عزت و حرمت خوب تھی۔ لیکن ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ آمدنی کم خرچ زیادہ۔ عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ اپنے آبائی وطن کی زیارت کا شوق ہوا۔ اور دہلی کا سفر کیا وہاں جو کچھ گذرا آگے بیان ہوگا۔ فی الحال تسلسل داستان کیلئے یہ سُن لیجئے کہ ہنگامۂ غدر میں مرزا حیدر شکوہ نے نہایت عاقبت اندیشی سے کام لیا۔ اور بیلی گارد میں جہاں انگریزی فوج محصور تھی داخل ہوکر سرکار کمپنی بہادر کی حفاظت میں آگئے۔ قیام امن کے بعد انکے مشاہرہ میں پانچسو کا اضافہ ہوا۔ اور اسطرح ڈیڑھ ہزار

ماہوار اس خاندان کی تنخواہ خزانۂ انگریزی سے مقرر ہوئی۔ مرزا حیدر شکوہ دل شکستہ ہوکر عازم عتبات عالیات ہوئے اور ماہ صفر سنہ ۱۲۹۰ھ مطابق سنہ ۱۸۷۳ء میں بمقام مشہد مقدس جوار رحمت میں پہونچے۔ انکے بڑے صاحبزادے جو "مرزا ولیعہد" مشہور تھے بزرگوں کی پونجی بیچنے کے بعد لکھنؤ میں عسرت اور تنگدستی سے زندگی کے دن گذارتے رہے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا!!

مرزا سلیمان شکوہ کے چھوٹے بھائی مرزا سکندر شکوہ اور انکے بیٹے عباس شکوہ بھی لکھنؤ تشریف لائے۔ اور یہیں کی خاک پاک کا پیوند ہوئے۔ لیکن انکے دردناک احوال کی تفصیل سے کچھ علاقہ نہیں۔

شہزادوں کا دلی آنا اور بادشاہ کے تبدیل مذہب کا افسانہ

باز آمدم بر سر داستان۔ شہزادہ سلیمان شکوہ کے پوتے مرزا حیدر شکوہ اور مرزا نور الدین ۱۸۵۰ء میں دہلی پہونچے۔ ہر طرح صاحب لیاقت تھے شعر و سخن سے ذوق آتش سے تلمذ تھا۔ بادشاہ نے اپنا عزیز سمجھ کر خلوت و جلوت کا رفیق بنایا۔ دل کے راز ظاہر کئے اور کمپنی کی طرف سے جو شکایتیں پیدا ہوگئی تھیں انکا تذکرہ کیا۔ باہم مشورہ سے یہ رائے قرار پائی کہ مقدمۂ ولیعہدی کی پیروی کیلئے مرزا حیدر شکوہ بادشاہ کی طرف سے وکیل مقرر کئے جائیں اور آگرہ۔ کلکتہ وغیرہ صدر مقامات پر حاضر ہوکر حقوق شاہی کے برقرار رکھے جانیکا مطالبہ کریں اور مرزا جواں بخت کی ولیعہدی طے کرادیں۔ لیکن یہ صلاح بارآور نہوئی۔ سرکار انگریز کے ایجنٹ متعینہ دہلی نے صاف الفاظ میں کہدیا کہ وکالت کے عہدہ پر شہزادوں کے مقرر کرنیکی کوئی نظیر نہیں ہے۔ اور جدید قاعدہ جاری نہیں کیا جاسکتا!

مگر شاہزادے بڑے ہنرمند تھے یہ نسخہ مفید نہوا تو دوسری دوا تجویز کی۔ بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ مذہب اثنا عشریہ قبول کریں تاکہ فرمانروائے اودھ سے رابطہ یک جہتی قائم ہو،

اور دونو متحد ہو کر مرزا جواں بخت کی ولیعہدی سرسبز کرا دیں۔ بلکہ ایک سفیر شاہ ایران کے پاس بھیجا جائے اور نادر کے تخت گاہ سے تاجدار دہلی کی حفاظت کیلئے امداد طلب کیجائے۔ اس تجویز پر عمل کی نوبت نہ آئی تھی کہ بادشاہ بیمار ہو گئے۔ مرض کو اشتداد ہوا۔ ایک دن جانکنی کی سی حالت طاری ہو گئی۔ برطانوی حکام نے یہ سمجھ کر کہ کہیں بادشاہ کے انتقال پر تخت حاصل کرنیکی غرض سے شہزادوں میں باہمی جنگ نہ چھڑ جائے قلعہ کے باہر ایک پلٹن متعین کر دی۔ حاضرین دربار نے اس واقعہ کا ذکر بادشاہ سے کیا۔ اُنھوں نے معاً کمشنر دہلی کو پیغام بھیجا۔

"جناب عالی! کیا آپ کا خیال ہے کہ میری لاش انگریزوں سے جنگ و جدال کریگی؟ کیا آپ مجھے اطمینان کے ساتھ مرنے بھی نہ دینگے"؟ کمشنر نے خط پڑھتے ہی پلٹن کو واپس بلا لیا۔ اور بوڑھا بادشاہ تن تنہا چھوڑ دیا گیا۔ ابھی زندگی باقی تھی مصائب کا پیالہ لبریز نہیں ہوا تھا فرد قرار داد جرم میں کئی دفعات کا اضافہ ہونے کو تھا۔

مرزا حیدر شکوہ نے منت مانی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے تو لکھنؤ میں حضرت عباس ع کی درگاہ پر علم چڑھاؤنگا۔ اور تیمارداروں کو مشورہ دیا کہ آخری وقت ہے۔ بادشاہ کو خاک شفا دیجائے۔ اللہ کی شان۔ خاک کی چٹکی اکسیر بنگئی۔ مرض کا زور گھٹا اور چند روز میں صحت کلی حاصل ہو گئی۔ جشن صحت دھوم دھام سے منایا گیا۔ استاذ ذوق نے بڑے زور شور کا قصیدہ لکھا۔ اور خلعت کے علاوہ خطاب "خان بہادر" اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرہ انعام پایا۔[1] اس قصیدہ کا قطعۂ ذیل بہت مشہور ہے۔

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدر منیر

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

ظفر کے دیوان چہارم میں ایک قطعہ بند غزل ہے جو اسی جشن صحت کی یادگار ہے۔

---

[1] سوانحعمری شمس العلما ذکاءاللہ نوشتۂ پادری سی۔ ایف۔ اینڈریوز صاحب ۱۲

محفلِ شادیِ ظفر آج بھی ہو کل بھی ہو　　　گھر ترا شادی کا گھر آج بھی ہو کل بھی ہو
رات کو ہو رتجگا دن کو چھنک بھی شہا　　　دھوم یہ شام و سحر آج بھی ہو کل بھی ہو
باعثِ صحت تری روز ہے دن عید کا　　　کیونکہ نہ خوش ہر بشر آج بھی ہو کل بھی ہو
آج شبِ قدر ہو کل کا ہو دن روزِ عید　　　یُمنِ شفا کا اثر آج بھی ہو کل بھی ہو

جشنِ صحت سے فراغت کے بعد شہزادگان مہمان لکھنؤ واپس گئے اور اپنے ساتھ چند کاغذات لیگئے جنپر بادشاہ کی مُہر ثبت تھی۔

اُسوقت لکھنؤ آجکا سا اُجڑا دیار نہ تھا۔ رنگیلے پیا جانِ عالم[1] کی راجدھانی تھی۔ گلیوں میں ہُن برستا تھا۔ ہر ایک محلہ شہرِ عشق اور ہر ایک کوچہ حسن آباد تھا۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر ادا کرنے کے لئے حضرت عباسؑ کی درگاہ پر علم چڑھانیکا ارادہ کیا۔ بادشاہ دہلی سے امداد لیکر سامان جلوس و احتشام فراہم کیا۔ سارا شہر اُمنڈ آیا۔ شاہی خاندان کے تمام ارکان شہر کے رؤسا اور امرا شریک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطانِ عالم نے علم مبارک کی مشایعت کی اور حضرت مجتہد العصر نے اپنے مقدس ہاتھوں سے علم چڑھایا۔

اس رسم کو خاص اہمیت حاصل ہونیکی یہ وجہ ہوئی کہ مرزا حیدر شکوہ نے حضرت قبلہ و کعبہ کے حضور میں ایک عریضہ پیش کیا جو پنسل[2] سے لکھا ہوا تھا اور جسپر بادشاہ دہلی کی مُہر ثبت تھی۔ عریضہ کا مضمون یہ تھا کہ بادشاہ دہلی نے مذہب اثنا عشریہ اختیار کر لیا ہے۔

---

[1] لکھنؤ کے آخری تاجدار واجد علیشاہ کیطرف اشارہ ہے۔ سلطانِ عالم شاعر بھی تھے۔ اختر تخلص تھا۔ غدر کے زمانہ میں انکو کچھ دنوں کیلئے قیدِ فرنگ کا تجربہ ہوا تھا اسوقت ایک مختصر رسالہ مصائبِ اہلبیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بیان میں لکھا تھا۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں ؎

ہوں شاہ اودھ نام واجد علی　　　مگر ملک تعبیر ہے خواب کی ۱۲

[2] دستور تھا کہ شاہی فرامین پر سیسہ کے قلم یعنی پنسل سے بنایا جاتا تھا ۱۲

یہ خبر لکھنؤ کے کوچہ و بازار میں پھیل گئی اور دار السلطنت کے باشندوں کو نہایت مسرت ہوئی۔ دہلی میں بھی خبر پہونچی۔ لکھنؤ والوں کو جسقدر خوشی ہوئی تھی اُس سے زیادہ دلی والوں کو رنج ہوا۔ تمام شہر میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ بادشاہوں کا مذہب شاہ عالم اول کے وقت سے مشتبہ ہوا تھا۔ لیکن علی الاعلان اظہار شیعیت کا یہ پہلا موقع تھا۔ بہادر شاہ نبض شناس تھے۔ سارا الزام مرزا حیدر شکوہ کے سر تھوپا اور تبدیل مذہب سے انکار کیا۔ حکیم احسان اللہ خاں مقرب خاص تھے اُنھوں نے اس خبر کی تردید کیلئے رسالے شایع کرائے۔ شہر کے گلی کوچوں میں اشتہارات چسپاں کئے گئے کہ یہ افواہ بے بنیاد ہے۔ مرزا غالب نے ایک مثنوی حکیم صاحب کی فرمائش سے فارسی زبان میں لکھی جسمیں مرزا حیدر شکوہ۔ مجتہد العصر بلکہ مذہب شیعیت پر بھی اعتراض تھے ع

(مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلی مرے آگے!)

بادشاہ نے ایک کتاب "حقیقت مذہب اہل سنت وجماعت" پر تصنیف کی۔ مرزا غالب نے اسپر زور شور سے تقریظ لکھی اور "خاص وعام کو اعلیٰ حضرت کا ثبات قدم مسلک تسنن پر باور کرایا"۔ بہادر شاہ نے حاشیہ نشینوں سے بیان کیا کہ مرزا حیدر شکوہ نے متعدد کاغذات اپنے ہاتھ سے لکھ کر مُہر شاہی خود ثبت کرلی ہے۔ البتہ ایک فرمان حضرت مجتہد کے نام بادشاہ نے لکھایا ہے مگر اسمیں تبدیل مذہب کا تذکرہ نہیں ہے۔ صرف یہ بیان ہے کہ جو حضرات اہلبیت سے محبت نہ رکھے وہ مسلمان نہیں ہے۔ دوستوں نے باشندگان دہلی کے اطمینان قلوب کیلئے کمپنی بہادر کے ایجنٹ کی معرفت اُس فرمان کی نقل لکھنؤ سے منگوائی مگر اتفاق سے (!!) اُس میں وہی مضمون پایا گیا جسکی شہرت تھی۔ یعنی بادشاہ نے مذہب اثنا عشریہ قبول کرلیا ہے۔

مرزا ابوظفر نے واقعی مذہب تبدیل کیا تھا یا اظہار تشیع سلاطین ایران و اودھ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ایک پولیٹکل چال تھی! آج جبکہ نہ بہادر شاہ اس عالم میں ہیں اور نہ مرزا حیدر شکوہ۔ اس معمے کا تسکین بخش حل بہت دشوار ہے۔ دل کا راز سوائے علام الغیوب کے

کون جان سکتا ہے لیکن اسمیں شک نہیں کہ بادشاہ کو محبت اہل بیت میں غلو اُس سے زیادہ تھا جتنا کہ اُنکے ہمعصر ہموطن ظاہر کرتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

میرا حامی ہے پیشوا ہے علی ‏ میرے ہر درد کی دوا ہے علی

جو اُس امام کا ہی دوست ہے خدا کا دوست ‏ قبول ہوتی ہے اُس کی علی الدوام نماز

جو ہو حسینؑ کا دشمن اُسے کہاں ایمان ‏ اگرچہ پڑھتا بھی ہو وہ برائے نام نماز

نماز پڑھ کے سدا سجدہ و قیام کے ساتھ ‏ وظیفہ چاہیئے ذکر غم امام کے ساتھ

ہیں در دولت سے ہوتے بہرہ ور شاہ و گدا ‏ پھر بھلا اس در کے ہوتے کس سے کیجئے التجا

آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں پر ظفر ہے آپ کا ‏ آیئے اب تو مدد کے واسطے بہر خدا

یا حسینؑ ابن علیؑ بندہ بہت ناچار ہے

مستغنی کونین ہی رکھ اپنے ظفر کو ‏ محتاج نہ کر حیدرِ کرار کسی کا

محرم میں بادشاہ فقیر بنتے۔ سبز کپڑے پہنتے اور گلے میں سبز جھولی ڈالتے تھے۔ چھٹی تاریخ کو تھوڑی دیر کیلئے سدّے ہاتھوں میں لیکر اور چاندی کی زنجیر کمر میں ڈال کر گشت کرتے تھے۔ ساتویں کو مہندی بڑی دھوم دھام سے اُٹھتی تھی اور بادشاہ بہ نفس نفیس اُسکی مشایعت کرتے تھے۔ آٹھویں کو حضرت سقائے حرم کی یادگار میں لال کھاروے کی لنگی باندھ کر بہشتی بنتے اور شربت کی بھری ہوئی مشک کاندھے پر رکھ کر معصوموں کو شربت پلاتے تھے۔ دسویں تاریخ کو موتی مسجد میں عاشورہ[1] کی نماز پڑھ کر ظہر کے وقت حاضری کے دسترخوان پر نیاز دیتے تھے۔ دسترخوان پر شیرمالیں چنی ہوتی تھیں اور شیرمالوں پر کباب۔ پنیر۔ پودینہ۔ ادرک۔ مولیاں۔ کترے کے

---

[1] یہ ایک چشمدید گواہ کا بیان ہے۔ ملاحظہ ہو بزم آخر۔ مرتبہ منشی فیاض الدین مرحوم۔

رکھی جاتی تھیں۔

یہ رسوم اہلسنت میں نہ اُسوقت رائج تھے، نہ اب ہیں۔ خصوصًا نماز عاشورہ اور حاضری کا سنیوں کے مذہب میں قطعًا وجود نہ تھا۔

واضح رہے کہ یہ قواعد وآداب قلعہ معلّٰی میں اُسوقت ملحوظ رکھے جاتے تھے جبکہ حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید دہلی کے اہلسنت سے تمام رسوم قبیحہ اور بدعات چھوڑا چکے تھے سوائے طبقۂ جہلا اور گروہ متصوفہ کے کوئی سنی ان افعال کو نظر استحسان سے نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ بادشاہ پر بھی وہابی علما کا کافی اثر تھا۔

عظیم آباد کے مشہور "متبع سنت" واعظ مولوی ولایت علی جو حضرت سید اور مولانا شہید کے اصحاب ورفقا میں سے تھے لیکن نعمت شہادت سے محروم رہ گئے تھے اسی زمانہ کے قریب دہلی تشریف لائے۔ نواب زینت محل کے اُستاد مولوی امام علی انکے مرید ہوئے۔

بادشاہ نے مولوی صاحب کو قلعہ میں طلب فرمایا۔ دیوان خاص میں اجلاس ہوا تخت شاہی کے نیچے فرش مکلف بچھایا گیا۔ بادشاہ نے لب فرش تک استقبال کیا مصافحہ اور معانقہ کے بعد مسند پر ایک طرف حضرت کو بٹھایا اور دوسری جانب خود بیٹھے عطر وپان کی تواضع ہوئی امرا اور دربار اپنے اپنے مقامات پر ایستادہ تھے۔ فرنگی قلعہ دار بھی شریک مجلس تھے اور (صاحب تواریخ عجیبہ معروف بہ سوانح احمدی کی روایت کے مطابق) بادشاہ کے سر پر مُورچھل ہلاتے تھے۔ مولوی صاحب نے دنیا کی بے ثباتی پر وعظ شروع کیا۔ وزیر اعظم نے جھک کر عرض کی کہ دوزخ اور عذاب کا بیان بادشاہ کے سامنے نہ کیجئے۔ لیکن مولانا نے نہ مانا اور ایسی پُراثر تقریر کی کہ بادشاہ بیگمات۔ اور شہزادے زار زار رونے لگے۔ بعد ختم مجلس مولانا کو محلات شاہی کی سیر کرائی گئی۔ اور پچاس خوان الوان نعمت کے بھرے ہوئے نذر کئے گئے۔ یہ بھی گذارش کی گئی کہ مولانا ماہ رمضان قلعہ میں بسر کریں تاکہ بادشاہ اور شہزادوں کو مواعظ میں شرکت کا موقع ملے۔

لیکن مولوی صاحب نے وہاں قیام خلاف مصلحت سمجھا کیونکہ حکام انگریز مختلف اشخاص سے دریافت کرتے تھے کہ یہ مولوی[1] کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے ؟

بادشاہ کا مذہب واقعی گومگو کا معمہ تھا۔ ایک دن مراسم عزاداری میں غلو تھا۔ دوسرے روز سرگروہ "تبعین سنت" کی خاطرداری میں انہماک۔ تیسرے روز عرس اور مجالس حال و قال میں شرکت۔ چوتھے دن راکھی سلونو کے میلہ کی تیاری !!

کسکی ملت میں گنوں آپکو بتلائے شیخ
تو کہے گبر مجھے۔ گبر مسلماں مجھ کو

حضرت شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت حسن عسکری اسی عرصہ میں رونق فزائے دہلی ہوئے۔ اور دربار شاہی میں وہ رسوخ و اقتدار حاصل کیا جو بعد کو ان فرشتہ صورت بزرگ کی شہادت کا سبب بنا۔ ظفر کے دیوان چہارم میں مندرجۂ ذیل اشعار کی مخاطب غالباً آپ ہی کی ذات والا صفات ہے۔

ہو گیا آپکا اسطرح سے آنا جو ادھر — کشش شوق ظفر ہی تمھیں حضرت لائی
ہے یقیں آپکے آنیسے وہ ٹلجائیگی — گردش چرخ ستمگر ہے جو آفت لائی
خازن مخزن اسرار تمھیں ہو کہ قضا — آپکے پاس کلید در دولت لائی
اس خزانہ سے مجھے بھی تو عنایت کچھ ہو — میری قسمت تمھیں اہی گنج سعادت لائی
بسکہ گنجینۂ عرفاں ہے تمھارا سینہ — نہ تہیدست گیا یاں جسے قسمت لائی

---

[1] مولوی صاحب نے محرم ۱۲۶۹ھ میں انتقال کیا۔ انکی بابت ایک لطیفہ مشہور ہے کہ جس زمانہ میں وہ دلی تشریف لائے ہیں۔ دارالسلطنت میں اُلّو کے حلت و حرمت کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ایک فریق اُلّو کو حلال کہتا تھا اور دوسرا حرام۔ بعض حضرات نے آپ سے استفتا کیا تو بولے کہ "بھائیو میں اُلّوؤں کے جھگڑے میں نہیں پڑتا" ۱۲

یہی قصہ عاشقانہ انداز میں :-

مدت کے بعد آج ادھر کیونکر آئے ہو | از خود جو آئے ہو مرے گھر کیونکر آئے ہو
آنکھیں ملا کے ہم سے کرو بات صاف صاف | کیا آپکو ہے مد نظر۔ کیونکر آئے ہو
آنا تمھاری ذات سے تو یاں بعید تھا | اپنے تھے نصیب! مگر کیونکر آئے ہو
کہنے لگے کہ تم بھی عجب شخص ہو کوئی | ہم سے جو پوچھتے ہو ظفرؔ "کیونکر آئے ہو"
لائی ہے کھینچکر کشش دل ہی آپکی | کہتے ہو بار بار "ادھر کیونکر آئے ہو"
اس پوچھنے پہ ہم تو نہ پھر آئینگے کبھی | منہ سے نہ کہنا بار دگر کیونکر آئے ہو

قدرت نے اسرار غیب پر پردہ ڈال رکھا ہے ورنہ اس سوال کا جواب نہایت آسان تھا کہ " خاک گور" کھینچکر لائی ہے۔

اسپ تازی بر نشست و شاد تاخت | خونبہائے خویش را خلعت شناخت
اے شدہ اندر سفر با صد رضا | خود بہ پائے خویش تا سور القضا

اس دردناک کہانی کو تھوڑی دیر کیلئے بند کر کے خاندان مغلیہ کی آخری باز یب تجمل شادی کا تماشہ دیکھئے۔

مرزا جواں بخت کی شادی

معلوم ہے کہ مرزا جواں بخت نواب زینت محل کے لاڈلے فرزند اور مرزا شاہ رخ کی وفات کے بعد بادشاہ کے سب سے زیادہ عزیز نور بصر تھے۔ انکی شادی کتخدائی میں وہ سامان کیا گیا کہ مرزا جہانگیر اور سلیم شہزادوں کی شادیوں کی داستان تقویم پارینہ ہو گئی۔ تکلفات رسم ساچق و منہدی و برات و آرائش شہر و روشنی بیان کرنا بیکار ہے۔ البتہ ایک چشم دید گواہ کا

ﻟﮧ حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی " داستان غدر" صفحہ ۱۷ و ۱۸ = ۱۲

بیان بزم نشاط اور تقسیم طعام کے اہتمام کی بابت اسی کی زبان سے نقل کیا جاتا ہے۔

"قرینۂ محفل سب سے جداگانہ تھا۔ دیوان کی بارہ دری میں جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئی تھیں، ہر در میں ایک طائفہ جدا رقص کرتا تھا۔ شاہزادگان کی محفل جدا جدا۔ ملازمین معززین کی انجمن جدا، فرقہ سپاہ کی بزم جدا۔ شاگرد پیشہ کیلئے جدا۔ اسیطرح ہر فریق کی محفل جدا تھی۔ اہل شہر کیلئے حکم عام تھا کہ آئیں اور تماشائے رقص و سرود سے محظوظ ہوں۔ رقاصان پری پیکر ہر طرف سرگرم ناز و انداز تھے اور مہ جبینان ناہید نواز زمزمہ پرداز۔ دس بارہ روز تک یہ محفلیں گرم رہیں۔

کل ملازمین شاہی اور رؤسائے شہر کے واسطے توڑہ جات کا حکم تھا جسکا جی چاہے زر نقد پچاس روپیہ توڑہ کی قیمت لے خواہ توڑہ لے۔ جتنے قلم کے نوکر تھے نام بنام سب کو توڑے تقسیم کئے جاتے تھے مثلاً میرے والد کا توڑہ جدا۔ میرے نام جدا۔ میرے چھوٹے بھائی کے نام جدا۔ وہ بھی نوکر تھا۔ میری والدہ کے نام جدا۔ کیونکہ ایک تنخواہ انکے نام بھی تھی۔ میں نے مہتمان توڑہ بندی سے کہلا بھیجا کہ آٹھ روز کے بعد ایک توڑہ بھجوادیا کرو۔

اس دریا دلی سے تقسیم توڑہ جات کی ہوئی تھی کہ جس روز توڑہ آتا تھا۔ تمام عزیز و اقارب دوست احباب کے گھر کھانا تقسیم ہوا کرتا تھا۔ ایک توڑہ میں طعام اسقدر ہوتا تھا کہ ایک محفل شکم سیر ہو کر کھالے۔ میرے مکان کا تمام دالان بھر جاتا تھا۔ ایک ایک طباق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ طرح کے پلاؤ، رنگ برنگ کے میٹھے چاول، سرخ۔ سبز۔ زرد۔ اُودے۔ پانچ سیر کی باقرخانی۔ ایک شیریں۔ ایک نمکین اور کئی قسم کے نان غرض کہ اقسام خوردنی سے کوئی شئے باقی نہ رکھی گئی تھی۔ اسکے علاوہ جن شعرا نے قصائد تہنیت اور سہرے وغیرہ لکھے تھے باوجودیکہ ملازم تھے مگر سب کو صلے و خلعت و انعام عطا ہوئے۔ شاگرد پیشہ کو جوڑے تقسیم کئے گئے۔

غالب مرحوم کی رسائی دربار شاہی میں ہو چکی تھی۔ نواب زینت محل کے ایما سے انھوں نے یہ سہرا کہکر زرنگار کاغذ پر لکھ کر ایک سونے کی کشتی میں رکھ بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں نذر گزرانا۔

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا | باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے | ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی | ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی | تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا | ہے رگ ابر گہربار برابر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں | دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ استاد ذوق سے فرمایش کر کے ایک سہرا لکھوایا:۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا | آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی | کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے در انجم سے فلک | کشتیٔ زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا
تابش حسن سے مانند شعاع خورشید | رخ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا
تابنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم | گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
در خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا | واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا
جنکو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو | دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اُسی وقت اُنھیں ملا اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔

تصوّف

بہادر شاہ پر فقر و درویشی کا رنگ ایام ولیعہدی سے چڑھا ہوا تھا لیکن اب حوادث گوناگون نے یہ نشہ بہت تیز کر دیا۔ تخت سلطنت پر بیٹھ کر اسرار و نکات تصوف بیان فرماتے اور طالبین کو ہدایت[1] و تلقین کرتے تھے۔ سلسلۂ پیری و مریدی فروغ پر تھا۔ جو خوش نصیب شرف بیعت سے فیضیاب ہوتے اُن کو شجرہ عنایت فرماتے۔ مسئلہ وحدت الوجود کی تعلیم دیتے۔ اور ایک سرخ رنگ کا رومال بطور تبرک عطا فرماتے تھے۔ بیشتر مریدین کو پانچ روپیہ ماہوار بطور مدد معاش کے خزانہ عامرہ سے ملتا تھا۔ اور اس طمع سے مریدین کی تعداد میں روز افزوں ترقی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچی کہ سرکار کمپنی بہادر کے دیسی سپاہی بادشاہ کے مرید ہونے لگے۔ ایک جمعدار حمید خاں نام بھی اس نعمت سے مشرف ہوا تھا۔ رزیڈنٹ کو اندیشہ ہوا کہ فوج کے سپاہی اگر بادشاہ کے حلقہ بگوش ہوئے تو بوقت ضرورت حق نمک فراموش کریں گے۔ لہذا اہلکاران فوج کو بہادر شاہ سے بیعت کرنے کی حکماً ممانعت کی گئی۔ لیکن دہلی کے دوسرے باشندے اس خوان کرم سے بے تکلف بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ اگرچہ بادشاہ سلامت کو تصوف میں اسقدر غلو تھا کہ گلستاں کی شرح ایک صوفی کے نقطۂ نگاہ سے خود لکھی اور اشغال و اذکار پر ایک کتاب "سراج المعرفت" نام مفتی میر لال سے لکھوائی لیکن یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ہجوم مصائب یا کثرت ریاضت نے حضور انور کا دل سرد کر دیا تھا۔ اور آتش شوق بالکل بجھ گئی تھی، نہیں ہرگز

[1] مرزا غالب مرحوم نے "مہر نیمروز" کے دیباچہ میں اسی پر چوٹ کی ہے۔

شبلی از منبر دہد آواز عشق — شاہ ما بر تخت گوید راز عشق

شاہِ ما دارد بہم در رہبری — خرقۂ پیری و تاج خسروی

شاہی و درویشی ایں جا باہم است — بادشاہ عہد قطب عالم است ۱۲

نہیں۔ عمر شریف ستر برس سے متجاوز تھی اُس وقت کا واقعہ ہے کہ حضور انور نے راکھی سلونو کے میلہ کی تقریب میں راجہ بھولا ناتھ کو پچاس روپیہ اور تخت خاص کے کہاروں کو ایک اشرفی مرحمت فرمائی۔ اس عیش و عشرت کے وقت میں حضور انور نے ایک مطربہ زہرہ پیکر ماہ طلعت کو شرف مناکحت سے اعتبار و امتیاز کا رتبہ مرحمت فرمایا۔ اختر محل خطاب دیا۔ دو سو روپیہ ماہوار مقرر فرمایا۔ ایک خواجہ سرا اور خدمت گار ڈیوڑھی پر مقرر کئے۔ اور اعلیٰ اعلیٰ قسم کے بہت سے زیور عطا فرمائے۔ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

اے ظفر جو شباب کے دن تھے	بس وہی خورد و خواب کے دن تھے
دور عشرت تھا اور عہد نشاط	جام صہبائے ناب کے دن تھے
مہندی مل کر نہاتے تھے ہر روز	نہ مقرر خضاب کے دن تھے
کرتے آرام سرد خانہ میں	تابش آفتاب کے دن تھے
جانتے رات کو بھی جاڑے کی	ہم نشہ میں شراب کے دن تھے
جتنی پیتے تھے روز رے۔ اس سے	پیتے دونی سحاب کے دن تھے
تھا "کلوا واشربوا" پر اپنا عمل	کہ شراب و کباب کے دن تھے
تھا نہ کچھ دلمیں خوف روز حساب	گنہ بے حساب کے دن تھے
نہ یہ راتیں تھیں آہ و زاری کی	اور نہ یہ رنج و تاب کے دن تھے
رہے پیری میں اس لئے جیتے	دیکھنے کچھ عذاب کے دن تھے

یہ تماشہ بھی قابل دید ہے:۔

چمن میں ابر و گل ہو پھر تو چھلیں ہوں تماشہ ہو
نشے میں رشک گل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو

لہ احسن الاخبار بمبئی ۲۴ ستمبر ۱۸۴۸ء ۱۲

کنارِ آب ہو مہتاب ہو ساغر ہو مینا ہو
جو یہ سامان کل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو
رباب و چنگ ہو بزم طرب ہو اور مطرب ہو
دف و سنے ہو دہل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو
پڑا دریا میں ہو عکس چراغاں اور وہ مہوش،
کھڑا بالائے پل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو
پئیں مے اسقدر باہم نشہ کا ہووے یہ عالم
حیا کا اپنے قل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو
ہوا ٹھنڈی ہو آدھی رات ہو یا وہ ہو یا ہم ہوں
چراغ اسوقت گل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشہ ہو

(لذت گناہ ہنوز دل میں باقی ہے !
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگران کردہ گناہونکی سزا ہے)

محاسن اخلاق،

بادشاہ سلامت باوجود ناسمجھ دل کے ہاتھوں ناچار ہونیکے مکارم اخلاق سے متصف تھے۔ انکے حاشیہ نشین بیان کرتے ہیں کہ عجز و انکسار۔ کسر نفس۔ عفو و حلم۔ ترحم اور حسن خلق کے زیوروں سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ کوئی کلمہ تمکنت و سطوت کا زبان پر نہ لاتے اور خود کو ادنیٰ بندگان بارگاہ کے برابر تصور کرتے تھے۔ بُرے نخوت و رعونت پاس ہو کر نہ نکلی تھی، ہر بندۂ خدا سے اخلاق و تواضع کا شریفانہ برتاؤ کرتے تھے۔ زہد و صلاح۔ طہارت و تقویٰ

کی جانب مائل تھے۔ منہیات و ممنوعات شرعیہ سے احتراز کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایام ولیعہدی
سے بوجہ اپنی دینداری۔ پرہیزگاری۔ رحمدلی اور فیاضی کے ہر دلعزیز تھے۔ اُنکو غریبوں سے
بہت اُنس تھا اور مشہور ہے کہ اُنکی مساوات پسندی اسقدر تھی کہ وہ اپنے خادموں کو کھلائے
بغیر خود کھانا تناول نہیں فرماتے تھے۔

علما و فضلا کی صحبت سے اُن کو دلچسپی تھی اور اصحاب کمال کی خدمت اپنی حیثیت سے بڑھکر
کرتے تھے شاعری اور شعرا کی قدردانی کی بابت آیندہ اوراق میں قلم فرسائی کیجائیگی۔

شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال و رغالب کی شاگردی،

تاریخ کا سلسلہ درست رکھنے کیلئے اس مقام پر اندراج ضروری ہے کہ
صفر ۱۲۷۱ھ میں بادشاہ کے اُستاد حضرت شیخ ابراہیم ذوق نے باغ جہاں کی راہ لی۔
بادشاہ کو بہت افسوس ہوا۔ اور بار بار مرحوم کے حقوق یاد کرکے اظہار قلق فرماتے رہے جشن
ملتوی فرمایا۔ اور اُنکے صاحبزادہ شیخ محمد اسمٰعیل کو خلعت تعزیت سے سرفرازی بخشی۔ نواب مرزاخاں
داغ (شاگرد ذوق) کی مرزا فخرو ولیعہد کے وسیلہ سے قلعہ میں آمد و رفت تھی لیکن ولیعہد معتوب تھے
اور اُنکے متوسل کا چراغ نواب زینت محل کے سامنے جلنا ممکن نہ تھا۔ بادشاہ داغ کی طباعی
اور شستہ بیانی کے معترف تھے مشہور ہے کہ قلعہ کے ایک مشاعرہ میں داغ نے بے اصلاحی
غزل پڑھی جسکا شعر تھا ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی — کسی کا اسطرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

بادشاہ کے حسب حال تھی۔ دل پر چوٹ لگی۔ نو عمر شاعر کو اپنے پاس بلایا اور پیشانی پر
بوسہ دیا۔ گر منصب اُستادی خالی ہوا تو ولیعہد کے آورده کا تقرر محال تھا۔ حافظ غلام رسول ویران

ا؎ ۱۳۰۵ھ میں انتقال ہوا۔ مزار پر یہ شعر کندہ ہے :-

فاتحہ مرقد ویراں پہ بھی پڑھتے جانا — اُن سے کہدو جو ہیں اس رہ سے گذرنے والے

شاگرد ذوق کو یہ منصب عنایت کیا گیا اور خدمت اصلاح مرزا اسداللہ خاں غالب سے متعلق ہو گئی خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ "مرزا غالب اس کام کو بادل ناخواستہ سرانجام کرتے تھے"۔ اور ایک ناظر سے روایت کرتے ہیں کہ مرزا کو بادشاہ کی آٹھ نو غزلیں بنانے میں اس سے زیادہ دیر نہیں لگتی تھی جتنی کہ "ایک مشاق استاد کو چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دیکر درست کرنے میں لگتی ہے"۔

ظفر کا وہ کلام جو غالب کی "بادل ناخواستہ" اصلاح سے مزین ہوا تھا غدر میں تلف ہو گیا یا حکیم احسان اللہ خاں مرحوم نے جنکے پاس ترتیب دیوان کیلئے جمع ہوتا تھا غائب کردیا۔ اسلئے نہیں کہا جاسکتا کہ بادشاہ کو غالب کی اصلاح سے فائدہ پہونچا یا نہیں اور درحقیقت بادشاہ صرف "ایک ایک دو دو مصرعہ کہتے تھے" اور غالب ان مصرعوں پر غزلیں لکھدیتے تھے یا یہ روایت بھی "شہزادہ پرستی" کا ثمر ہے۔ بادشاہ کہنہ مشق شاعر تھے ممکن ہے کہ آخری زمانہ کا کلام استقام سے بالکل خالی ہو۔ اور اسوجہ سے مرزا غالب کو کاوش اور جانکاہی کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔ اور ناظر حسین مرزا کی روایت کا آخری حصہ بالکل صحیح ہو یعنی صرف کہیں کہیں اصلاح دیکر درست کردیتے ہوں۔

غرض ذوق کے بعد مرزا غالب کی قلعہ میں خوب قدر افزائی ہوئی۔ لیکن مرزا اپنی فطرتی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہٗ اور حضرت امیر خسروؒ کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا۔ مرزا نے اُسیوقت یہ شعر انشاکر کے پڑھا ؎

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو۔ سراج الدین کو غالب

بادشاہ کے چھوٹے صاحبزادہ مرزا خضر سلطان غالب کے شاگرد ہوئے اور انھیں کی طرف "الہامی شاعر" نے اپنی مشہور غزل کے ایک شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز　　شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

---

[۱] یادگار غالب صفحہ ۲۶
[۲]

چند سال کے بعد ۲۶ برس کی عمر میں درگاہ نظام الدین اور شہر دہلی کے درمیان یہ "نونہال" خون سے سینچا گیا۔ لہو کے فواروں سے جسم لال ہوا اور سر شہر کے خونی دروازہ پر آویزاں کیا گیا!!

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے　　　یہی دنیا کا کارخانہ ہے

کمپنی بہادر سے تعلقات اور ولیعہدی کا قضیہ مکرر

ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظر میں بہادر شاہ کی یہ وقعت رہ گئی تھی کہ ۱۸۵۲ء میں دارالسلطنت کے ہنود اور اہل اسلام کے درمیان گاؤکشی کے قدیم مابہ النزاع سوال پر کچھ جھگڑا ہوا۔ بادشاہ نے معاملہ کو سلجھانے کے لئے مشورۂ نیک دینا چاہا۔ اور اپنی رائے لفٹنٹ گورنر صوبہ مغربی و شمالی کو جو دہلی کا اصلی حاکم تھا لکھ کر بھیجی تو صاحب بہادر نے جواب دیا کہ "مقامی عہدہ داروں سے جو قیام امن کے ذمہ دار ہیں رجوع کرنا چاہیئے"

القاب و آداب میں بھی فرق آگیا۔ پہلے جو خطوط لفٹنٹ صاحب کی طرف سے بادشاہ کو جاتے تھے "ہز اٹ پلینیر یو مجسٹی" سے شروع ہوتے اور "یور مجسٹیز فیتھفل سرونٹ" پر ختم ہوتے تھے۔ مگر ۲۲ اگست ۱۸۵۲ء کو مسٹر کالون لفٹنٹ گورنر آگرہ نے مسئلہ گاؤکشی کے متعلق بادشاہ کے خط کا جواب دیا تو وہ القاب تحریر کیا جو ایک دوست دوسرے دوست کو لکھتا ہے یعنی شہنشاہ دہلی کا مرتبہ لفٹنٹ گورنر کے برابر رہ گیا۔ اگرچہ حقیقت میں اُتنی عزت بھی نہ تھی کیونکہ کسی قسم کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔

اب جو لکھتا ہے وہ یہ کاہے کو لکھتا تھا کبھی　　　ظفر دیکھ لو اُس بُت بے پیر کا پہلا کاغذ

۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو ولیعہد بعارضۂ ہیضہ دنیا سے رخصت ہوئے اور شبہ کیا گیا کہ اُنکو زہر دیا گیا ہے۔ ولیعہدی کا قصہ پھر اُبھرا۔ نواب زینت محل نے جان توڑ کوشش کی۔ بادشاہ نے جواں بخت کی ولیعہدی کا باضابطہ مطالبہ کیا اور ایک محضر پیش کیا جس پر اُنکے آٹھ بیٹوں کے

دستخط تھے۔ اور لکھا تھا کہ ہم سب خوش ہیں کہ زینت محل کا بیٹا ولی عہد مقرر ہو لیکن دوسرے ہی دن بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے مرزا قویش نے رزیڈنٹ کو اطلاع دی کہ محضر پر دستخط اضافۂ تنخواہ کا لالچ دیکر حاصل کیے گئے ہیں۔ اور اس منصب کا مستحق سوائے مرزا قویش کے کوئی نہیں ہے۔ کمپنی کو مزید کامیابی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مرزا قویش سے یہ شرط منظور کرالی کہ بہادر شاہ کے بعد لقب شاہی موقوف کیا جائے صرف خطاب "شہزادہ" باقی رہے۔ اور زر پیشکش جو اسوقت تک سوا لاکھ کے قریب تھا صرف پندرہ ہزار ماہوار رہ جائے۔ آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ شہزادہ نے یہ شرط تسلیم کرلی۔ اور سرکار کمپنی بہادر نے مرزا قویش کی ولیعہدی کا علان کردیا۔

جب یہ افسوسناک خبر ضعیف العمر باپ کے کان تک پہونچی تو اُسکے رنج و غم کی کوئی حد نہ تھی ایک نہایت دردناک نظم اس سانحہ جانگداز سے متاثر ہوکر لکھی جو چند گھنٹوں کے اندر شہر کے کوچہ و بازار میں پھیل گئی۔ لڑکے اُن اشعار کو مرثیہ کی طرح گاتے پھرتے تھے۔ اور بوڑھے اُسے سُن سُنکر روتے تھے۔ مکمل نظم اب دستیاب نہیں لیکن اس کا ایک شعر دلی والوں کی زبان پر ہے۔

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظام سلطنت
بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نام سلطنت

غدر ۱۸۵۷ء

غدر کی عبرت ناک داستان کوچہ و برزن میں مشہور ہے اور اسکے اسباب و علل واقعات و نتائج پر متعدد کتابیں اردو زبان میں تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں۔ لیکن ظفر کے سوانح نگار کو اس

دلخراش مضمون پر قلم فرسائی سے چارہ نہیں۔ بصد رنج والم اس افسانۂ غم کے وہ حسرت ناک مناظر مختصر الفاظ میں پیش کئے جاتے ہیں جنکو ہمارے ممدوح سے براہ راست تعلق ہے۔

منحوس ۵۷ء کے آغاز موسم بہار سے دہلی میں حیرت انگیز خبریں مشہور ہو رہی تھیں کوئی کہتا تھا کہ ایران کا کجکلاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوگا۔ کسی کا خیال تھا کہ زار روس ہند کی طرف پیشقدمی کریگا۔ کبھی خبر اُڑتی تھی کہ امیر کابل بادشاہ دہلی کو اغیار کی حراست سے آزاد کرانے آرہا ہے۔ کسی دن شہرت ہوتی تھی کہ ترکی اور فرانس نے باہم معاہدہ کیا ہے اور وہ شاہ ایران کو ساتھ لیکر ہندوستان کا تختہ اُلٹنے کی فکر میں ہیں۔ بد باطن غل مچاتے تھے کہ لال قلعہ میں اہل فارس کی آمد کا روزانہ انتظار ہے۔ اور حضرت شاہ حسن عسکری ایرانیوں کی فتح و نصرت کیلئے اعمال و ریاضت کی چلہ کشی میں مصروف ہیں۔ ایکدن جامع مسجد کے دروازہ پر کسی شریر نے اشتہار چسپاں کر دیا کہ شاہ فارس فوج لئے آرہا ہے اور ہندوستان کے مسلمانونکو اُس لشکر کی امداد کرنا چاہیئے۔ عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ۔ سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے نئی نئی خبریں سننے کے مشتاق تھے اور سامان تفریح کے فراہم کرنیوالے تازہ تازہ بشارتیں تصنیف کرتے اور اُنکی تشہیر کرتے تھے البتہ اس پیشینگوئی پر سب متفق تھے کہ عنقریب ایک زبردست انقلاب ہونیوالا ہے جس سے سلطنت برطانیہ کی طاقت ہندوستان میں ختم ہو جاویگی۔

تمام ملک میں افواہ پھیل گئی تھی کہ انگریز رعایا کو جبرًا عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ یہاں کے مراسم اور مذاہب مٹاکر اور تمدن و معاشرت فنا کرکے فرنگی تہذیب رائج کیجائیگی۔ دیسی ریاستیں سب ضبط کرلی جائینگی اور انگلستان کا قانون ہمالیہ سے راس کماری تک نافذ ہوگا۔

غرض رعایا دل تنگ تھی اور فوج بد دل۔ کہ اتفاقات قضا و قدر سے اُسی زمانہ میں ایک جدید قسم کے کارتوس آئے جنکو استعمال کرنیکے لئے دانتوں سے کاٹنے کی ضرورت تھی۔ بدمعاشوں نے شہرت دی کہ ان کارتوسوں میں گائے اور سُور کی چربی ملی ہوئی ہے۔ اور انکے رائج کرنے سے

مقصود یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں بیدین ہو جائیں اور پادریوں کو تبلیغ عیسویت میں آسانی ہو۔ یہ بے بنیاد خبر سارے ملک میں بجلی کی طرح پھیلی۔ ہندوستانی فوج اپنے افسروں سے ناراض اور بغاوت پر تیار تھی۔ اس افواہ نے بارود میں آگ لگا دی۔ کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیا۔ انگریزوں کے ارباب حل و عقد نے تدبر اور دانشمندی سے کام نہ لیا۔ اپنے سطوت و دبدبے کے اظہار کے لئے نزاعی کارتوسوں کے استعمال پر اصرار کیا اور ایرانی حکیم کا وہ زریں مقولہ بھول گئے "نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن + کہ جاہا سپر باید انداختن"۔ میرٹھ کی بڑی چھاؤنی رعب و داب کے مظاہرے کے لئے انتخاب کی گئی۔ ۸ مئی ۱۸۵۷ء کو دیسی سپاہی کارتوس قبول کرنے پر مجبور کئے گئے۔ انھوں نے انکار کیا تو منکروں کے سرکردہ حوالات میں بند کر دئے گئے۔ دوسرے دن پریڈ پر ان سرغنوں کو دس دس برس قید کا حکم سنایا گیا۔ انکی وردیاں تمام فوج کے سامنے سر میدان اُتاری گئیں۔ اور بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ سپاہی غم و غصہ سے بیتاب ہوئے لیکن اُس وقت کسی نے دم نہ مارا۔ شام کو بازار میں خبر مشہور ہوئی کہ دو ہزار بیڑیاں بنوائی گئی ہیں اور کل دوسرے انکار کرنیوالے گرفتار کئے جاوینگے۔

صبح ہوئی تو اتوار کا دن تھا اور مئی کی دسویں تاریخ انگریز افسر عبادت کے لئے گرجا گھر گئے۔ دیسی فوج بارکوں سے نکل کر جیلخانہ پہونچی۔ قفل توڑے اور قیدیوں کو چھڑا لائی۔ تھوڑی دیر کے بعد بارکوں کے چھپر جلا دئے اور افسروں کو قتل کرنا شروع کیا۔ انگریز مرد۔ بچہ۔ عورت۔ فوجی اور غیر فوجی جسپر آنکھ پڑی موت کا شکار ہوا۔ دن بھر میرٹھ میں قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ شام کو باغی فوج دہلی کی طرف روانہ ہوئی بعض انگریز افسروں نے موقع پاکر دن ہی میں ایک خط کمشنر دہلی کے نام روانہ کر دیا جسمیں بغاوت کا حال لکھکر اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ باغی دہلی کا رُخ کرینگے اور وہاں بندوبست ہونا چاہیئے مگر بدبختی سے یہ خط آدھی رات کو کمشنر کی کوٹھی پر پہونچا۔ صاحب بہادر خواب استراحت میں تھے اُنکو بیدار کر کے خط دیا گیا مگر نیند کے نشہ میں خط کون پڑھتا "ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولے" خط جیب میں ڈالکر سو رہے۔ صبح ہوئی تو باغی دہلی میں داخل ہو چکے تھے۔

دوشنبہ کے دن ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء (۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ) کو بادشاہ سلامت فریضہ صبح سے فارغ ہوکر جھروکے میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ دریا کے پل کیطرف آگ کے شعلے نظر آئے، دریافت حال کے لئے سوار بھیجے معلوم ہوا کہ میرٹھ کی فوج باغی ہوگئی۔ انگریزوں کو قتل کرڈالا۔ دہلی آرہی ہے گھاٹ کے انگریز حاکم کو مارڈالا ہے۔ اور اسکے بنگلہ کو آگ لگادی ہے۔ بادشاہ متحیر اور پریشان ہوئے حکم دیا کہ پل توڑ دیا جائے اور شہر پناہ کے دروازے بند کردئے جائیں تاکہ یہ فتنہ عظیم شہر میں داخل نہ ہوسکے۔ اتنے میں سواران باغیہ کشتیوں کے پل سے اتر کر سلیم گڈھ کے نیچے ہوتے ہوئے قصر شاہی کے پاس آپہونچے۔ زیر جھروکہ پرا جما کر استادہ ہوئے اور حسب قاعدہ سلامی دی۔ ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگے "ہملوگ آپکے پاس فریادی آئے ہیں۔ اُمیدوار انصاف ہیں، ہمنے اپنی جانیں بیچکر اور سر کٹوا کر کلکتہ سے کابل کے ڈیرے تک چودہ سو کوس میں عملداری انگریزی قائم کرادی اور ہماری استعانت سے تمام ہندوستان پر تسلط ہوگیا اب کوئی سرکش باقی نہ رہا تو سرکار کی نیت میں فتور آیا ہمارے دین ومذہب کے درپئے تخریب ہوئی ایک قسم کی بندوق ایسی ایجاد کی جسمیں کارتوس دانتوں سے کاٹ کر لگانا پڑے۔ کارتوس معلوم نہیں کس کس جانور کی جھلی سے منڈھے ہیں۔ ہم لوگوں نے تعمیل حکم سے انکار کردیا۔ نزاع بڑھ گئی۔ چار مہینہ سے یہ تنازعہ درپیش ہے۔ حکام میں کمیٹیاں ہوئیں اور ہم لوگوں میں بھی چٹھیاں دوڑ گئیں کہ زیادہ تشدد ہو تو ایک دن ایک تاریخ بالاتفاق تمام ہندوستان میں غدر مچادو۔ چنانچہ میرٹھ سے فساد کا آغاز ہوا۔ اور تمام فوج جادۂ اطاعت سے منحرف ہوگئی، ہم شبانہ روز میں تیس کوس کی مسافت طے کرکے یہاں آئے ہیں تاکہ بادشاہ سلامت ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں اور ہمارا انصاف فرمائیں۔ ہم دین پر بگڑ کر آئے ہیں" اس فریاد کا بادشاہ نے جو جواب دیا وہ تاریخی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مظلوم ظفر کو سپاہیوں کی نافرمانی سے کچھ تعلق نہ تھا۔

بادشاہ کے استاذزادے راقم الدولہ سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی اسوقت حضور اقدس

ہیں حاضر تھے اور اس گفتگو کے شاہد عینی ہیں۔ اُنھوں نے بادشاہ کا جواب "داستان غدر" میں بیان کیا ہے جسکے بیشتر الفاظ خود حضرت ظفر کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

جواب سنو بھائی مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہونکے ہمراہ گئی میرے باپ دادا بادشاہ تھے جنکے قبضہ میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جد و آبا کے نوکر چاکر اپنے خاندان نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضہ سے ملک نکل گیا۔ قوت لایموت کو محتاج ہو گئے۔ خصوصًا میرے جد بزرگوار حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی کو جب غلام قادر نمک حرام نے قید کر کے نابینا کیا ہے تو پہلے مرہٹوں کو طلب کیا گیا تھا۔ اور اُنھوں نے اُس نمک حرام کو کیفر کردار کو پہونچایا۔ حضرت بادشاہ کو قید سے چھڑایا۔ چند سال مرہٹے بادشاہ کی جانب سے مختار رہے۔ مگر بادشاہ کے صرف مطبخ کا بند و بست نہ کر سکے۔ لاچار ہو کر میرے دادا نے جانب سلطنت برطانیہ رجوع کی اور انگریزوں کو بلوا کر اپنے گھر کا مختار فرمایا۔ ملک ہندوستان اُنکے تفویض کیا۔ ان لوگوں نے حسب دلخواہ اخراجات شاہی کا بندوبست کر دیا۔ ملک میں امن و امان کا ڈنکا بجا دیا۔ اُس روز سے ہم لوگ باعیش و عشرت تمام بسر کرتے چلے آتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں مجھے ستانے کیوں آئے۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دونگا میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمھاری امداد کرونگا میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمھیں نوکر رکھونگا میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں مجھے کسی طرح کی توقع استعانت کی نہ رکھو۔ تم جانو یہ لوگ جانیں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمھارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمھاری صفائی کرا سکتا ہوں۔ تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو۔ میں نے صاحب ریزیڈنٹ کو بلوایا ہے۔ وہ میرے پاس آنیوالے ہیں میں پہلے اُنسے دریافت کر لوں۔ اُنسے مجھے حال فتنہ و فساد معلوم ہو جاویگا اور خدا چاہے تو

اس فساد کو میں رفع دفع کرا دونگا۔

گفتگو ہنوز ناتمام تھی کہ فریزر صاحب ریزیڈنٹ معہ قلعہ دار صاحب کے داخل ایوان خاص ہوئے بادشاہ اُنسے مخاطب ہو کر فرمانے لگے "کیوں بھائی یہ کیا فتنہ و فساد برپا ہو گیا۔ یہ مذہب کا جھگڑا کیسا اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مقدمہ دین آئین کا ہے۔ تعصب مذہبی بُری شے ہے۔ اس فتنہ کا جلد انسداد ہونا چاہیئے۔ مبادا ہندوستان میں عالمگیر ہو جائے اور لاکھوں آدمیوں کا کشت و خون ظہور میں آئے۔ یہ لوگ جاہل ہیں۔ فرقہ سپاہ جاہل ہوتا ہے۔ ان سے ٹھیک کے کام نکالنا چاہیئے۔ انکو ہدایت کرو کہ یہ لوگ اس فساد سے باز آجائیں۔ جائے تعجب ہے کہ تم کو اس معاملہ کی اب تک خبر نہیں" ریزیڈنٹ نے بذات خاص باغیوں کو فہمایش کی مگر کچھ اثر نہوا ایک سپاہی نے اسیوقت صاحب بہادر پر بندوق کا فیر کیا مگر قضا نہ تھی بچگئے۔ بادشاہ سے عرض معروض کر کے شہر کے بندوبست کے لئے باہر نکلے۔ باغیوں نے تعاقب کیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد شہر میں قتل و غارت کی آگ مشتعل ہو گئی۔ ریزیڈنٹ بہادر قلعدار۔ دیسی سپاہی مارے گئے۔ دوکانیں لٹیں۔ اور سارے شہر میں شیطان کا راج ہو گیا۔ باغیوں کو رسد کی ضرورت ہوئی اور ملازمین شاہی سے مدد مانگی۔ امداد کا اقرار اس شرط سے کیا گیا کہ غارت گری و آتش زنی کا بازار بند کیا جائے۔ بھوکوں نے منظور کیا۔ تو شہر میں منادی کی گئی۔ خلق خدا کی۔ ملک بادشاہ کا۔ حکم جہاں پناہ کا۔ کسی پر کوئی ظلم نہ کرے ورنہ ملزم شاہی قرار دیا جاویگا۔ دوکانوں پر پہرا بٹھایا گیا اور شہر میں امن قائم ہوا۔ باغی اپنے حرکات سے کب باز آتے تھے۔ بنیک گھر لوٹ لیا اور فرنگی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے اُنکے خون پر آمادہ ہوئے۔ شاہی ملازموں نے اس خون ناحق سے منع کیا۔

بصد کوشش ان بے گناہوں کو شاہی حفاظت میں لیکر قلعہ میں رکھا۔ لال قلعہ میں بھی باغیوں کی عملداری تھی۔ بادشاہ بالکل بے بس تھے۔ انکے صریح حکم کے خلاف یہ سب محبوسان بلا کر قتل

کرڈالے گئے۔ مرزا مغل۔ مرزا خضر سلطان وغیرہ شہزادے باغی فوج کے افسر بنا دیئے گئے،
اور مظلوم بادشاہ کو بجبر و اکراہ ان افعال کی رضامندی دینا پڑی۔ بادشاہ سلامت کے نام سے حکم احکام
جاری ہونے لگے لیکن انکے ملازموں کی یہ حقیقت تھی کہ ہر وقت فرشتہ اجل سامنے تھا۔ ظہیر
دہلوی لکھتے ہیں کہ "ایک دن ہم لوگ حکیم احسن اللہ خاں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ پوربیوں
نے آکر ہمکو گھیر لیا اور بندوقیں بایوں پر کھینچکر کھڑے ہوگئے۔ اور کہا کہ تم سب بیدین ہو۔ تم
کرسٹان ہو۔ انگریزوں کو چٹھیاں لکھتے ہو۔ ہم لوگوں نے حیران ہوکر اُن سے کہا کہ ایک دفعہ ہم
سب کو اڑا دو روز کے جھگڑے سے تو فیصلہ ہو جائے اُن میں سے ایک دو افسر سمجھدار تھے وہ
ساتھیوں کو سمجھا کر لے گئے۔"

بادشاہ کی یہ عزت تھی کہ مہتاب باغ میں اُن بدتمیزوں نے اپنے گھوڑے باندھے تھے
ایک پوربیا فربہ اندام پستہ قد ادھیڑ پچاس پچپن برس کی عمر کا منہ پر داڑھی گاڑھے کا کرتہ دھوتی
بندھی ہوئی۔ سر پہ ایک انگوچھہ۔ جال کرچ افسروں کی اُسکے گلے میں پڑی ہوئی عقب حمام
کے چبوترہ سے دربار میں آیا اور بادشاہ کو سلام کرکے پاس چلا آیا۔ بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا
سُنو بڈھو۔ "تمھیں ہمنے بادشاہ کیا"۔ ظہیر دہلوی نے اُسکے سینہ پہ ہاتھ رکھ کر دھکا دیا اور کہا
کہ او بے ادب، بادشاہوں کے دربار میں اسطرح گستاخی کرتے ہیں وہ دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا
اور گرتے گرتے سنبھلا۔ اور اُسنے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا۔ ظہیر نے بھی تلوار کھینچ لی۔ ایک
سیّدزادہ نے سپاہی کا گلا دبوچا دوسروں نے ظہیر کو روک لیا۔ لوگوں نے دھکے دیکر دیوان خاص
کے باہر کر دیا۔ بادشاہ نے خفا ہوکر مغلظات گالیاں دینا شروع کیں۔ اور حکم دیا کہ محل کی سواریاں
کراؤ اور خواجہ صاحب کو چلو۔ قلعہ چھوڑ دو۔ خود سوار ہوکر جالی کے دروازہ تک پہونچگئے تھے کہ
اتنے میں سب افسر جمع ہوکر دوڑ آئے اور بادشاہ کی سواری روک لی۔ ہرچند بادشاہ نے چاہا
کہ قلعہ سے چلے جائیں مگر وہ کب جانے دیتے تھے۔ ہوادار لوٹا کر تسبیح خانہ کو لے گئے۔ غرض

قلعہ میں حکومت دراصل باغیوں کی تھی۔ بادشاہ مفت بدنام تھے۔ ایک صادق البیان چشمدید گواہ کا بیان ہے کہ بادشاہ غریب کا یہ حال تھا کہ حیران پریشان محل میں رہتے تھے۔ باہر برآمد ہونا چھوڑ دیا تھا۔ ہر وقت مغموم متالم آبدیدہ رہتے تھے۔ گاہ بگاہ بوقت شب تخلیہ میں تسبیح خانہ میں گھڑی دو گھڑی آ بیٹھا کرتے تھے۔ اور اُن نمک حراموں کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ ایک دن حضور نے ہم سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ تم جانتے ہو آجکل جو سامان ہو رہا ہے اسکا انجام کیا ہونا ہے۔ حمید خاں جمعدار نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور ڈیرھ سو برس کے بعد اقبال یاور ہوا ہے گئی ہوئی سلطنت پھر واپس آئی ہے"۔ بادشاہ نے ارشاد فرمایا "تم لوگ نہیں جانتے ہو جو کہ میں جانتا ہوں۔ مجھ سے سُن لو۔ میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا یعنی بنائے فساد یال و دولت خزانہ ملک و سلطنت وغیرہ ہوا کرتے ہیں میرے پاس ان میں سے ایک بھی موجود نہ تھی۔ میں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا "کس نیاید بخانۂ درویش۔ کہ خراج زمین و باغ بدہ"۔

اُب جو منجانب اللہ غیب سے میرٹھ میں آگ لگی اور دلی میں آکر بھڑکی۔ فتنہ برپا ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلک غدار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے آجتک سلاطین چغتائی کا نام چلا آتا تھا اور اب آیندہ کو نام و نشان یک قلم معدوم و نابود ہو جاویگا۔ یہ نمک حرام جو اپنے آقاؤں سے منحرف ہوکر یہاں آکر پناہ پذیر ہوئے ہیں کوئی دن میں ہوا ہوئے جاتے ہیں جب یہ اپنے خاوندوں کے نہوئے تو میرا کیا ساتھ دینگے۔ یہ بدمعاش میرا گھر بگاڑنے آئے تھے بگاڑ چلے۔ انکے جانے کے بعد انگریز لوگ میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعہ کے کنگرے پر چڑھا دینگے اور تم لوگوں میں سے کسیکو باقی نہ چھوڑینگے۔ اور اگر کوئی باقی رہ جاویگا تو آج کا میرا قول یاد رکھو کہ تم روٹی کا ٹکڑا مُنہ میں لوگے اور وہ منھ میں سے اُٹکر دور جا پڑیگا"۔ یہ سخنان دردانگیز فرماکر پھر محل میں داخل ہوگئے۔

ان دانشمندانہ اقوال کا اُس فرد جرم سے مقابلہ کیا جائے جو فوجی عدالت کے سامنے

مظلوم بادشاہ پر لگائی گئی تھی تو اہل دنیا کی بے اعتباری اور نیرنگ زمانہ کا حیرت انگیز منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ؂

جب تو ی شہادتوں سے ثابت ہو گیا کہ غدر کی لڑائیوں سے ہمارے ممدوح کو دلچسپی نہ تھی تو اُن لڑائیوں کی تفصیل ہماری کتاب کے موضوع سے خارج ہے البتہ اس دور انقلاب کی تین چار مقتدر ہستیوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ اول تو حکیم احسن اللہ خاں۔ دوسرے مرزا الٰہی بخش تیسرے بخت خاں۔ اور چوتھے مرزا مغل۔ اول بادشاہی طبیب تھے اور دوسرے بادشاہ کے سمدھی اور رشتہ دار۔ ان دونوں نے دور اندیشی اور عاقبت بینی سے انگریزوں سے سازکیا۔ اُنسے خفیہ نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کیا۔ ادھر بادشاہ کو صلاحیں دیتے اور اُدھر قلعہ کی ہر ایک خبر انگریزونکو پہونچاتے۔ باغیونکو کئی مرتبہ اُنکے حرکات پر شک ہوا لیکن بادشاہ نے انکی اعانت کی ایک بار جوش غضب میں حکیم صاحب کا مکان باغیوں نے لوٹ لیا لیکن ظل ہمایوں کے طفیل میں جان سلامت رہی

بخت خاں ایک انگریزی رسالہ کا صوبہ دار تھا وہ دہلی میں باغیوں کا سرغنہ بنا" لارڈ گورنر" کا خود ساختہ خطاب لیکر تمام سیاہ سفید کا مختار ہو گیا۔ مرزا مغل بادشاہ کے بیٹے اور فوج کے کمانڈر انچیف تھے لیکن اسقدر لیاقت نہ رکھتے تھے کہ انقلابی فوج کی رہنمائی کرسکیں بخت خاں بدبخت ہو لیکن جنگ کی قابلیت رکھتا تھا۔ ان دونوں اعلیٰ افسروں میں باہم اتفاق نہ تھا۔ مرزا مغل نادانی سے لارڈ گورنر کی کارروائیوں میں خلل اندازی کرتا تھا۔ باہمی کشمکش نے انتظام بد سے بدتر کردیا۔ حملہ آوری اور گور۔ مدافعت کی بھی قوت نہ رہی پنجاب کو براہ راست حکومت برطانیہ کے زیر نگیں ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ وہاں کی فوج بغاوت کے زہر سے محفوظ تھی۔ انگریزوں نے اُسی لشکر سے کام لیا نیپال سے گورکھے مدد کو بلائے۔ باغیوں کو شکست دیکر دہلی کے سامنے ایک پہاڑ پر اپنا مورچہ قائم کیا۔ کہتے ہیں کہ جس دن پہاڑی پر انگریزوں کی توپیں چڑھیں مظلوم بادشاہ نے اپنی عبادت گاہ میں عاجزی اور نیاز سے یہ دعا مانگی۔

"مجھ ضعیف اور ناتوان کے امتحان کا وقت آپہونچا۔ خداوندا مجھے صبر اور استقلال دے، میں اس ابتلاسے عہدہ برآ ہونے کا اہل نہیں میری شرم تیرے ہی ہاتھ ہے۔ ان سنگدل اور بدنصیب سپاہیوں کو عقل دے کہ وہ معصوم بچوں اور بےگناہ عورتوں پر ظلم نہ کریں۔ لیکن تیرے سوا کس سے کہوں، تو ہی سب کا حاکم اور ہر شے پر قادر ہے"

یوں کہنے کہ ؎ شہ چو عجز آں طبیباں را بدید + پا برہنہ جانب مسجد دوید۔

لیکن دعاؤں کا وقت گذر چکا تھا۔ دہلی کا محاصرہ ہو گیا۔ باغیوں نے قلعہ پر توپیں نصب کیں اور دونوں طرف سے گولہ باری ہونے لگی۔ شہر والے صبح کو انگریزی فوج کے مقابلہ کے لئے نکلتے تھے اور شام کو اپنی تعداد میں کمی کرا کے واپس آجاتے تھے۔ محاصرین کو بھی اپنی قلت محسوس ہونے لگی تھی کہ اُنکے پاس کئی ہزار سوار اور پیادے کی کمک پہونچ گئی اور ۱۴ ستمبر ۵۷ء کی خونریز لڑائی کے بعد جسمیں انگریزوں کے ۶۶ افسر اور ۱۱۰۴ سپاہی مجروح و مقتول ہوئے تھے اُنھوں نے شہر کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵ ستمبر سے ۱۸ ستمبر تک شہر کے اندر لڑائی ہوتی رہی مگر ہر قدم پر باغیوں کو شکست ہوتی تھی یہاں تک کہ ۱۹ ستمبر کو باغیوں کے پاس کوئی مورچہ باقی نہ رہا اور تمام شہر پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

لال قلعہ کے لئے وہ بڑی مصیبت کی رات تھی۔ بادشاہ نے ارادہ کیا کہ حویلی سے نکل جائیں اسوقت لارڈ گورنر بخت خاں خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی "اگرچہ دشمنوں نے شہر لے لیا ہے لیکن اس سے ہمارا کچھ نقصان نہیں ہوا ہے۔ تمام ہندوستان ہمارے ساتھ ہے اور ہر شخص کی نظر آپکی ذات گرامی پر ہے۔ آپ کچھ تردد نہ کریں میرے ساتھ تشریف لے چلیں میں پہاڑوں میں چھپ کر ایسی مورچہ بندی کرونگا کہ انگریز وہاں کامیاب نہو سکیں گے۔ دہلی پایۂ تخت ہے کوئی فوجی قلعہ نہیں ہے اور جنگ کے لئے نہایت نامناسب ہے۔ ہمنے چند مہینہ تک شہر کو بچائے رکھا یہی بڑی بات ہوئی۔ ہم نشیب میں تھے اور انگریز پہاڑی پر۔ کوئی ناتجربہ کار فوج بھی پہاڑی

ہوتی تو اسکو دہلی کا فتح کر لینا کوئی دشوار نہ تھا سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ حضور کے صاحبزادے مرزا مغل فوج کے کمانڈر انچیف بنائے گئے۔ وہ فنون حرب سے ناواقف تھے اور ان کو معلوم نہ تھا کہ خودسر اور سرکش سپاہیوں کو کسطرح قابو میں رکھا جاتا ہے اور اُن سے اطاعت اور فرمانبرداری کیونکر قبول کرائی جاتی ہے میری زندگی کا بڑا حصہ فوجی خدمات میں صرف ہوا ہے۔ اگر صاحبزادہ صاحب میرے انتظامات میں رخنہ نہ ڈلتے تو یقیناً انھیں سپاہیوں سے انگریزوں کے کثیر التعداد لشکر کو شکست دیتا۔ مگر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ تمام ہندوستانی ریاستیں ہمارے ساتھ ہیں وہ زبان سے خاموش ہوں لیکن اُنکے قلوب حضور کی مٹھی میں ہیں۔ اگر حضور نے کسی محفوظ مقام پر قلعہ بند ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کیا اور لڑائی کا پانسہ پلٹا تو تمام ملک حضور کا ساتھ دیگا"۔ بادشاہ اس تقریر سے متاثر ہوئے اور فرمایا کہ "ہم مقبرہ ہمایوں" جاتے ہیں اور تم کل صبح وہاں آکر ہم سے ملو اُسوقت مناسب جواب دیا جائیگا۔ بخت خاں رخصت ہوئے تو مرزا الٰہی بخش جو انگریزوں کی طرف سے اس خدمت پر مامور ہوئے تھے کہ بادشاہ کو باغیوں کے ساتھ ہرگز نہ جانے دیں خدمت عالی میں حاضر ہوئے۔ چناں چنیں کے بعد حرف مطلب زبان پر لائے نشیب و فراز سمجھا کر وعدہ کیا کہ میں انگریزوں سے ملکر تمام معاملات کی صفائی کرا دونگا۔ آپ پر یا آپکی اولاد پر کوئی حرف نہ آنے دونگا۔ بشرطیکہ آپ باغیوں کے ساتھ نہ جائیں۔ بادشاہ نے ان کو بھی کچھ جواب نہ دیا۔ صبح سویرے مع بیگمات اور بچوں کے باپ دادا کی حویلی سے باہر نکلے۔ ہمراہیوں کو مقبرۂ ہمایوں کی طرف روانہ کیا۔ اور خود درگاہ حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیا میں حاضر ہوئے۔ حسرت و یاس۔ خوف و ہراس کا عالم تھا چند خواجہ سراؤں اور ہوادار کے کہاروں کے سوا کوئی ساتھ نہ تھا۔ چہرہ زرد تھا۔ اور گرد وغبار سے ریش آلودہ و پراگندہ تھی۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی روایت کرتے ہیں کہ اُنکے نانا حضرت شاہ غلام حسن جو آستانۂ درگاہ کے خادم تھے بادشاہ کی آمد سُنکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے دیکھا کہ حضور رسالی مزار مبارک کے سرہانے بیٹھے ہیں۔ شاہ صاحب نے خیریت دریافت کی ارشاد ہوا کہ

"میں نے تم سے پہلے ہی کہدیا تھا کہ یہ کمبخت سپاہی خودسر ہیں اور انپر اعتماد کرنا غلطی ہے۔ خود بھی ڈوبینگے اور مجھ کو بھی ڈبوئینگے۔ آخروہی ہوا کہ بھاگ نکلے۔ بھائی اگرچہ میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں لیکن ہوں اُس خون کی یادگار جسمیں آخردم تک مقابلہ کرنے کی حرارت رہتی ہے۔ میرے بزرگوں پر اس سے زیادہ آڑے وقت پڑے ہیں اور اُنھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ مگر مجھے تو غیب سے انجام دکھا گیا ہے۔ اب اسمیں شک کی گنجایش نہیں کہ میں تخت ہند پر تیمور کی آخری نشانی ہوں مغلئی حکومت کا چراغ ٹمٹمارہا ہے اور کوئی گھڑی کا مہمان ہے۔ پھر جان بوجھکر کیوں فریدِ خونریزی کراؤں اسواسطے قلعہ چھوڑکر چلا آیا۔ ملک خدا کا ہے جسکو چاہے دے۔ سینکڑوں برس ہماری نسل نے سرزمین ہند پر بادشاہی کی۔ اب دوسروں کا وقت ہے۔ یہ کوئی رنج وانسوس کی بات نہیں۔ آخر ہمنے بھی تو دوسروں کو مٹاکر اپنا گھر بسایا تھا" اسی طرز کی حسرت ناک باتوں کے بعد بادشاہ نے ایک صندوقچہ دیا اور کہا "یہ تمھارے سپرد ہے۔ امیر تیمور نے جب ترکوں کو شکست دی تھی تو سلطان بایزید کے خزانہ سے یہ نعمت ہاتھ لگی تھی۔ اس میں حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کے پانچ بال ہیں جو آج تک ہمارے خاندان میں تبرک کی طرح چلے آتے ہیں۔ اب میرے لئے زمین وآسمان میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ ان کو لیکر کہاں جاؤں۔ تم سے بڑھکر اس امانت کا کوئی اہل نہیں۔ انکو حفاظت سے رکھنا۔ یہ میرے دل ودیدہ کی ٹھنڈک ہیں۔ جنکو آج کے دن کی ہولناک مصیبت میں اپنے سے جدا کرتا ہوں"۔

شاہ صاحب نے وہ صندوقچہ لیکر درگاہ کے توشہ خانہ میں داخل کردیا جہاں وہ اب بھی محفوظ ہے اور ہر سال ربیع الاول کے مہینہ میں تبرکات کی زیارت ہوتی ہے۔

اسکے بعد بادشاہ نے فرمایا "آج تین وقت سے کھانیکی مہلت نہیں ملی۔ اگر گھر میں کچھ تیار ہو تو لاؤ" شاہ صاحب نے کہا "ہم لوگ بھی موت کے سامنے کھڑے ہیں۔ کھانے پکانے کا ہوش نہیں جاتا ہوں جو کچھ موجود ہے حاضر کرونگا۔ بہتر ہے کہ حضور خود غریب خانہ پر تشریف لے چلیں جبتک

زندہ ہوں اور میرے سر پہ سلامت ہیں آپکو کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا۔"

بادشاہ نے فرمایا "آپ کا احسان جو ایسا کہتے ہو۔ مگر اس بوڑھے جسم کی حفاظت کے لئے اپنے پیر زادی کی اولاد کو قتل گاہ میں بھیجنا مجھے کبھی گوارا نہو گا۔ زیارت کر چکا۔ امانت سونپ دی۔ اب دو لقمے سلطان جی کے لنگر سے کھاؤں تو مقبرے چلا جاؤنگا۔ وہاں جو قسمت میں لکھا ہے پورا ہوگا"

شاہ صاحب گھر گئے اور وہاں سے بیسنی روٹی اور سرکہ کی چٹنی لائے۔ بادشاہ نے تین وقت کے بعد وہ نعمت کھا کر پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کر کے مقبرہ ہمایوں کی طرف روانہ ہوگئے۔

اُدھر مرزا الٰہی بخش انگریزوں سے نامہ و پیام کر رہے تھے۔ دفتر خبر رسانی کے حاکم اعلےٰ میجر ہڈسن کو لکھدیا کہ میں نے بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روک لیا ہے۔ کل مقبرہ ہمایوں میں دوبارہ ملاقات کا وعدہ ہوا ہے۔ جسوقت وہ رخصت ہو آپ تھوڑی فوج لیکر آئیں اور بادشاہ کو گرفتار کرلیں۔ غرض بادشاہ نے مقبرے میں بخت خاں سے آخری ملاقات کی الٰہی بخش بھی موجود تھے۔ بخت خاں نے بادشاہ کے لیجانے پر اصرار کیا۔ مرزا نے مخالفت کی بادشاہ نے بخت خاں سے مخاطب ہو کر فرمایا "بہادر مجھے تیری بات کا یقین ہے۔ مگر جسم کی قوت نے جواب دیدیا ہے اسلئے میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور بسم اللہ کر کے یہاں سے جاؤ۔ کچھ کام کر کے دکھاؤ۔ ہماری فکر نہ کرو۔ اپنا کام انجام دو۔" بخت خاں مایوس ہو کر مقبرے کے شرقی دروازہ سے دریا کی طرف چلا گیا۔ اور اپنی باقی ماندہ فوج لیکر ایسا غائب ہوا کہ آجتک کسی جاسوس کو اُسکا سراغ نہ لگا معلوم نہیں کہ زمین میں دھنس گیا یا آسمان پر چڑھا۔ مدتوں اسکی تلاش جاری رہی مگر کہیں پتہ نہ چلا۔

جب میجر ہڈسن کو معلوم ہوا کہ باغی سردار رخصت ہوگیا اور بادشاہ کے پاس کوئی حمایتی باقی نہیں ہے تو اُنھوں نے جنرل سے بادشاہ کے گرفتار کرنے کی اجازت طلب کی اُسوقت بحث پیش ہوئی کہ بہادر شاہ کو زندہ گرفتار کیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔ جنرل صاحب کی رائے تھی کہ

ہلاک کر دیا جائے۔ مگر دوسرے افسروں نے اختلاف کیا۔ کیونکہ اسوقت تک صرف دہلی پر قبضہ ہوا تھا۔ اور تمام ہندوستان میں فساد کے شعلے مشتعل تھے ایسی حالت میں بادشاہ کا زندہ رکھنا ہی مصلحت تھا۔ اس صلاح و مشورہ کے بعد میجر ہڈسن مقبرے کے دروازہ پر آیا اور بادشاہ کو باہر بلایا۔ زینت محل ہمراہ تھیں انھوں نے عرض کی کہ پہلے آپ میجر ہڈسن سے اپنی میری اور جواں بخت کی جان کی امان طلب کیجئے تب باہر جائیے۔ بادشاہ نے میجر کے پاس یہی پیام بھیجا۔ اُسنے قبول کر لیا اس قول و قرار کے بعد بادشاہ برآمد ہوئے۔ پالکی لگائی گئی۔ اکبر و جہانگیر کا وارث سرکاری ملزم کی حیثیت سے اُس پالکی پر سوار کیا گیا اور گوروں کے پہرے میں دہلی بھیجدیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غدر کا انجام

صفر ۱۲۷۴ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو بادشاہ زینت محل کے مکان میں جو لال کنوئیں کے قریب تھا قید کئے گئے۔ دوسرے دن مرزا الٰہی بخش نے مخبری کی کہ مرزا مغل۔ مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر وغیرہم مقبرہ ہمایوں میں پوشیدہ ہیں یہ میجر ہڈسن اپنے سپہ سالار سے اجازت لیکر سو سپاہیوں کے ساتھ انکو گرفتار کرنے روانہ ہوا۔ تینوں شہزادہ مقبرے کے اندر تھے اور اُنکے ہمراہ لفٹنٹ میکڈاول[۱] کے قول کے مطابق تین ہزار مسلمان تھے اور انکے علاوہ تین ہزار مسلح سپاہی قریب ہی جھاڑیوں میں موجود تھے۔ ہڈسن اور میکڈاول نصف میل کے فاصلہ پر ٹھہرے۔ کیونکہ اپنی قلیل جمعیت لیکر مقبرہ پر دھاوا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ شہزادوں کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ گرفتاری منظور کریں یا انجام مزاحمت کے لئے تیار ہوں۔ آدھ گھنٹہ کے بعد شہزادوں کی طرف سے جواب آیا کہ ہماری جانوں کی ذمہ داری کیجائے تو ہم اپنے تئیں حوالہ کر سکتے ہیں۔ میجر نے کہا کہ میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ شہزادوں کو بغیر کسی شرط کے ہمارے پاس حاضر ہونا چاہیئے۔ اب مقبرہ میں باہم گفت و شنید

[۱] ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد ۲۲۔ صفحہ ۱۰۷۔

شروع ہوئی شہزادوں نے کہا کہ تیموری خاندان کے لوگ اسطرح مجبور ہو کر قید نہیں ہوا کرتے، تلوار اُٹھاتے ہیں اور لڑتے ہیں۔ مارتے ہیں یا مر جاتے ہیں۔ دارا شکوہ کو جب اورنگزیب نے قتل کرنا چاہا اور قاتل قید خانہ میں آئے تو دارا ترکاری چھیلنے کی چھُری لیکر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر جلّادوں سے مقابلہ کرتا رہا۔ ہمکو بھی دلیرانہ کام کرنا چاہیئے۔ مرنا تو ہر حال میں ہے پھر بہادری کی موت کیوں نہ مریں۔

مرزا الٰہی بخش نے نصیحت کا دفتر کھولا۔ اور وہ آتار چڑھاؤ دکھائے کہ اجل نصیب شہزادے مقابلہ اور مجادلہ سے دست بردار ہو گئے۔ اور مرزا کے مشورہ کے موافق تن بہ تقدیر بلا کسی شرط کے رتھوں پر سوار ہو کر ہڈسن کے پاس چلے آئے۔ انگریزوں نے اُن مصیبت زدوں کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور دہلی کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ جب دہلی ایک میل رہ گئی تو رتھوں کو ٹھہرایا اور شہزادوں کو حکم دیا کہ اپنے کپڑے اُتار ڈالیں۔ بدنصیب بے بس تھے۔ فرمان کی تعمیل کی۔ لباس شہزادگی جسم سے جدا کیا۔ اور حسرت سے ہڈسن کی طرف دیکھنے لگے کہ اب کیا کہتا ہے۔ انکو خیال تھا کہ شاید اس جگہ سے مقید کر کے پا پیادہ لیجانے کا ارادہ ہے۔ مگر نوشتۂ تقدیر کچھ اور تھا۔ میجر غصہ سے دیوانہ ہو گیا اور اپنے ہاتھ سے شہزادوں کے مقام قلب پر تین تین گولیاں ماریں۔ مظلوم "ہائے دھوکا" کہکر گرے اور تھوڑی دیر خاک و خون میں غلطاں رہ کر راہی عدم ہوئے۔ جب لاشیں ٹھنڈی ہو گئیں تو انکو شہر میں لایا اور کوتوالی کے دروازہ پر ایک رات دن سر بازار آویزاں رکھا۔ مشہور ہے کہ ان مظلوموں کے سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں بطور تحفے کے ارسال کئے گئے۔ لیکن یہ انسانیت سوز وحشیانہ حرکت کسی معتبر تاریخ میں درج نہیں ہے اور غالبًا غلط ہے۔

ہڈسن کے اس ظلم پر شریف[۱] انگریزوں نے اعتراض کیا۔ لارڈ رابرٹس نے اسکو خطا قرار دیا جسٹس میکارتھی نے قتل عمد کے برابر سمجھا مسٹر ڈسرتلی نے کہا کہ انگریز افسر نے کانپور کے ناناصاحب

[۱] ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد ۲۲، صفحہ ۱۸۸ - ۱۸۹ ۔ ۱۲

کی سی وحشیانہ کارروائی کی مگر اس ستمگاری کے تھوڑے ہی دن بعد وہ لکھنؤ میں عالم باغ کے قریب باغیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ لہذا اُسکے خلاف زیادہ لکھنا مناسب نہیں ہے۔

اس خونریزی کے بعد دہلی میں قتل عام شروع ہوا جسکی بابت انگلستان کا ایک مورخ اسپنسر والپول لکھتا ہے کہ وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہیں مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے دہاں جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے تھے اور پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دیجاتی تھی والپول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دیگئی جنہیں سے ۲۹ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

مُولف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ ۲۷ ہزار مسلمان قتل کئے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔ غریب بادشاہ زینت محل کی حویلی میں قید تھا۔ خوراک کیلئے پانچ روپیہ یومیہ ملتے تھے اور اس ظلم وستم کی خبریں روز سنا کرتا تھا۔

مشتاق تھے جسکے خبر آئی کہ مُوا وہ
جس دوست کو پوچھا یہ سُنا قتل ہوا وہ

اس دورِ مصیبت کی یادگار ایک نظم ہے جسکو اشناس ظفر کی تصنیف بتاتے ہیں۔ مگر اسقام کلام پر نظر کرکے بعض بحثہ رس اسکو حامی تخلص ایک غیر معروف شاعر کیطرف منسوب کرتے ہیں۔ اُس دار وگیر کی گرم بازاری میں الفاظ کی نشست پر غور کرنے کا کسکو موقع تھا۔ دل کے جذبات تھے جو زبان پر بیساختہ آئے اور اب تک دردمندوں کی زبان پر زندہ ہیں وھو ہذا۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہو کیا کیا انپہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے

یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بیگنہ
وے کلمہ گویوں کے سمت سے ابھی دل میں اُنکے غبار ہے

نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

یہی تنگ حال جو سب کا ہی یہ کرشمہ قدرت رب کا ہی
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے

شب و روز پھولوں میں جو تلے کہو خار غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انہیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے

سب ہی جا وہ ماتم سخت ہے کہو کیسی گردش بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہی نہ وہ شاہ ہی نہ دیار ہے

جو سلوک کرتے تھے اور سے اب ہیں دیکھو وہ کس طور سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے رہا تن پہ اُنکے نہ تار ہے

یہ وبال تن پہ ہے سر مرا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا مجھے اپنی زندگی بار ہے

کیا ہے غم ظفرؔ تجھے حشر کا جو خدا نے چاہا تو بر ملا
ہمیں ہے وسیلہ رسُول کا وہ ہمارا حامی کار ہے

قصہ مختصر ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو لال قلعہ میں فوجی عدالت کے سامنے مظلوم بادشاہ کا مقدمہ پیش ہوا۔ شاہجہاں کے ایوان خاص میں اُنکا فرزند ملزم کی حیثیت سے حاضر کیا گیا اور وکیل سرکار نے حسب ذیل جرائم کی فرد پیش کی۔

(۱) سراج الدین محمد بہادر شاہ انگریز کمپنی کے پنشن خوار تھے مگر انھوں نے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء

سے یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیان محمد بخت خاں صوبہ دار رجمنٹ توپ خانہ اور دوسرے افسران افواج انگریزی کو غدر اور بغاوت کرنیکی ترغیب دی اور اس کام میں امداد کی۔

(۲) بہادر شاہ نے اپنے بیٹے مرزا مغل کو جو انگریز کمپنی کی رعیت تھے اور دوسرے باشندگان کو جو انگریزی رعایا تھے انگریزی گورنمنٹ کے خلاف ہتھیار اُٹھانے میں مدد کی اور سازش میں شریک ہوئے۔

(۳) بہادر شاہ نے ۱۰ مئی سے یکم اکتوبر تک باوجود انگریزی رعایا ہونے کے اپنے آپ کو بادشاہ ہند مشہور کیا اور شہر دہلی پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ اور مرزا مغل اور محمد بخت خاں سے سازش کی اور علم بغاوت بلند کیا اور گورنمنٹ سے جنگ کے لئے آمادہ ہوئے۔ اور گورنمنٹ برطانیہ کا تختہ اُلٹ دینے کی غرض سے ہتھیار بند فوجوں کو دہلی میں جمع کیا۔ اور اُنکو لڑنے پر آمادہ کیا۔

(۴) ۴۹ نفر انگریزوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے قتل کرایا۔ یا قتل کرانے میں حصّہ لیا۔ اور دیگر انگریزوں اور عورتوں اور بچّوں کو قتل کرانے میں مدد دی۔ اور والیان ریاست کے نام احکام جاری کئے کہ وہ عیسائیوں اور انگریزوں کو اپنے حدود میں جہاں پائیں قتل کریں۔ اور یہ سب بموجب قانون ۱۶ ۱۸۵۷ء سنگین جرائم ہیں۔

بادشاہ نے ان جرائم سے انکار کیا۔ بہت سے کاغذات ثبوت جرم میں پیش ہوئے جن پر بادشاہ کی طرف سے احکام لکھے ہوئے تھے اور بعض پر پنسل سے دستخط تھے۔ متعدد چٹھیاں ہوئیں۔ حکیم احسن اللہ خاں، انگریز افسران فوج، بعض ہندوؤں اور مسلمانوں کی شہادتیں ہوئیں۔ انگریز غیض وغضب میں تھے لیکن عدالت کے سامنے اُنھوں نے اپنے علم کے مطابق سچ بولنے کی کوشش کی۔ حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ نے بادشاہ کے حق میں کلمۂ خیر کہنے کی ہمّت نہ کی۔ بہت سے ضروری واقعات جنکے وہ چشمدید گواہ تھے اور جن سے بادشاہ کی بےگناہی ظاہر ہوتی تھی عدالت کے سامنے بیان نہیں کئے۔ لیکن حتی الامکان کلمات ناشائستہ

اور اتہامات بے بنیاد سے بھی احتراز کیا۔ شاہ حسن عسکری جنکا ذکر صفحات ماسبق میں کئی مرتبہ آچکا ہے۔ دوران مقدمہ میں گرفتار ہو کر آئے۔ اُنھوں نے سچی شہادت دی اور بادشاہ کے خلاف کوئی کلمہ نہیں کہا۔ اُن سے سوال کیا گیا کہ وہ دلی سے کیوں فرار ہو کر روپوش ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ جب ہر طرف مشہور ہو گیا کہ شہر میں قتل عام ہوگا۔ اور میں نے لوگوں کے غول کے غول فرار ہوتے اور شہر سے باہر نکلتے دیکھتے تو میں بھی چلا گیا۔ پہلے میں درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رح میں مقیم رہا پھر درگاہ حضرت قطب صاحب رح چلا گیا۔ وہاں سے گڈھی ہرسرد پہونچا جہاں میں بیمار ہو گیا۔ پھر اور کئی مقامات پر گیا۔ آخر کار لکھنوتی آیا۔ جہاں معلوم ہوا کہ گنگوہ میں میری جستجو ہو رہی ہے۔ میں نے اپنی مرضی سے وہاں جانے کی ٹھانی اور چلا گیا میرے بھائیوں کو میرے آنے کی خبر پہونچی جو گنگوہ میں تھے اور اُنھوں نے مجھے مخفی کرنے کی کوشش کی، مگر میں نے کہدیا کہ پوشیدہ رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ اور جب میں درگاہ امام صاحب میں بیٹھا ہوا اور اد پڑھ رہا تھا سپاہیوں نے تنہا پا کر گرفتار کر لیا اور دلی لے آئے بادشاہ نے جرح سے انکار کیا شاہ صاحب حراست میں واپس چلے گئے۔ اور بادشاہ کا مقدمہ ختم ہونے کے بعد یا اُسی کے درمیان اُن کو پھانسی دیدی گئی۔ شہادت ثبوت ختم ہونیکے بعد بادشاہ نے بیان تحریری داخل کیا جو ایک اہم تاریخی دستاویز ہے اور جس سے ظہیر دہلوی کی بیان کردہ روداد غدر کی تائید ہوتی ہے۔ بیان کے خاتمہ پر بادشاہ کی حلفی تصدیق ہے اور ہم اُسکو لفظ بہ لفظ نقل کرتے ہیں۔

بادشاہ کا تحریری بیان

اصل حقیقت یہ ہے غدر کے روز کی مجھے پہلے سے خبر نہیں تھی۔ آٹھ بجے کے قریب باغی سوار دفعتاً آگئے اور محل کی کھڑکیوں کے نیچے شور و غل مچانے لگے۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ انگریزوں کو قتل کر کے میرٹھ سے آئے ہیں اور اپنے ایسا کرنے کا یہ عذر پیش کیا کہ اُن سے گائے اور سُور کی چربی سے بنے ہوئے کارتوسوں کو منھ میں رکھ کر کاٹنے کو کہا گیا تھا۔ جو کہ سر ہندو اور مسلمانوں کے دھرم کو ستیاناس کرتا تھا۔ میں نے یہ سُنکر قلعہ کے دروازہ بند کرائے اور فی الفور قلعہ دار کو اس امر کی اطلاع پہونچادی۔ وہ خبر سنتے ہی خود میرے پاس آئے اور جہاں باغی جمع تھے جانا چاہا اور دروازہ کھولدینے کی درخواست کی۔ میں نے انھیں اس ارادہ سے باز رکھا۔ بہر کیف جب دروازہ نہ کھولنے دیا تو وہ اوپر آگئے اور برآمدہ میں کھڑے ہو کر سپاہیوں سے کچھ کہا جسے سنتے ہی وہ لوگ چلے گئے۔ اسکے بعد قلعہ دار یہ کہہ کر کہ وہ ہنگامہ کو روکنے کا بندوبست کرینگے میرے پاس سے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد مسٹر فریزر نے دو توپوں اور قلعہ دار نے دو پالکیوں کے لئے خبر بھیجی۔ اور کہا کہ اُنکے پاس دو لیڈیاں ٹھہری ہوئی ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ انھیں محلسرا میں پہونچا دیا جائے۔ میں نے دو پالکیاں روانہ کیں اور حکم دیدیا کہ توپیں بھی بھیجدی جائیں۔ اسکے بعد میں نے سنا کہ پالکیاں پہونچنے بھی نہ پائی تھیں کہ مسٹر فریزر قلعدار اور دو لیڈیاں سب کے سب قتل کر دئے گئے۔ اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ باغی سپاہ دیوان خاص میں گھس آئی اور میرے عبادت خانہ میں بھی ہر طرف پھیل گئی اور مجھے چاروں طرف سے گھیر کر پہرہ لگا دیا۔ میں نے اسکا مطلب دریافت کیا اور چلے جانے کیلئے کہا جسکے جواب میں اُنھوں نے خاموش کھڑے رہنے کو کہا اور کہا کہ جب اُنھوں نے اپنی زندگیوں کو خطرہ میں ڈالا ہے تو اب اپنی طاقت کے موافق سب کچھ کر کے چھوڑینگے

خوف کھاکر کہیں میں قتل نہ کر دیا جاؤں۔ میں نے منہ سے اُف تک نہ کی۔ اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شام کے وقت یہ لوگ کئی انگریز مرد و عورت کو گرفتار کر کے لائے۔ جنھیں اُنھوں نے میگزین میں پکڑا تھا اور اُنکے قتل کا قصد کرنے لگے۔ میں نے باز رہنے کی درخواست کی۔ اسوقت تو میں انگریزوں کی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر باغی سپاہیوں نے انھیں اپنی ہی زیر حراست رکھا۔ متواتر دو موقعوں پر اُنھوں نے انگریزوں کے قتل کا قصد کیا اور میں نے منت و سماجت کر کے باز رکھا۔ اور قیدیوں کی جانیں بچالیں۔ آخری وقت اگرچہ میں مفسد بلوائیوں کو حتی المقدور باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اُنھوں نے میری طرف مطلق التفات نہ کیا۔ اور ان بیچاروں کو قتل کرنے باہر لے گئے۔ میں نے اُنھیں قتل کیلئے کچھ بھی حکم نہیں دیا۔ مرزا مغل۔ مرزا خضر سلطان۔ مرزا ابو بکر اور میرا ایک خاص مصاحب بسنت سپاہ سے مل گئے تھے۔ اُنھوں نے میرا نام شاید لیا ہو۔ لیکن مجھے علم نہیں کہ اُنھوں نے کیا کہا۔ نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے خاص مصاحبین میرے حکم سے سرتابی کر کے قتل میں شریک ہوئے ہوں۔ اگر اُنھوں نے ایسا کیا تو وہ مرزا مغل سے مرعوب ہو کر گذرے ہونگے۔ نیز قتل کے بعد مجھے اسکے متعلق کسی نے خبر نہیں دی۔ بعض گواہان نے شہادت میں میرے ملازمین کا مسٹر فریزر اور قلعہ دار کے قتل میں شریک رہنا بیان کیا ہے۔ میں اُسکا بھی وہی جواب دیتا ہوں۔ یعنی میں نے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اگر اُنھوں نے ایسا کیا۔ تو اپنی آزاد مرضی سے کیا۔ نہ مجھے اسکا بھی علم نہیں اور بات بھی مجھے نہیں بتائی گئی۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو میرا گواہ ہے کہ میں نے مسٹر فریزر یا اور کسی انگریز کے قتل کا حکم نہیں دیا۔ مکند لال و دیگر ہندو گواہان نے کہا ہے کہ میں نے حکم دیا تھا۔ بالکل غلط ہے۔ مرزا مغل و مرزا خضر سلطان نے احکام دئے ہوں تو تعجب نہیں۔ کیونکہ وہ سپاہ سے مل گئے تھے۔ بعد ازاں فوجیں مرزا مغل۔ مرزا خضر سلطان۔ مرزا ابو بکر کو میرے سامنے لائیں اور کہا کہ "ہم

انھیں اپنا افسر بنانا چاہتے ہیں" میں نے اُنکی درخواست رد کردی لیکن جب سپاہ ضد کرنے لگی اور مرزا مغل غصہ ہوکر اپنی والدہ کے مکان میں چلا گیا تو میں سپاہیوں کے خوف سے ساکت رہ گیا۔ اور پھر طرفین کی رضامندی سے مرزا مغل کمانڈر انچیف افواج مقرر ہوا میرے مہر کے ثبت شدہ اور دستخط کئے ہوئے احکام کی نسبت معاملہ کی اصل حالت یہ ہے کہ جس روز سے سپاہ آئی انگریزی افسروں کو قتل کیا۔ اور مجھے مقید کرلیا۔ میں انکے اختیار میں رہا جیسا کہ اب انگریزوں کے اختیار میں ہوں۔ تمام کاغذات جو مناسب سمجھتے میرے پاس لاتے۔ اور مجھے مہر ثبت کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ بسا اوقات احکام کے مسودے لاتے۔ اور میرے سکرٹری سے اُنھیں صاف کرواتے کبھی اصلی کاغذات لاتے اور انکی نقلیں دفتر میں رکھدیتے۔ اسلئے کئی خطوط اور مختلف تحریریں روئداد کی فائل بن گئی ہیں۔ بارہا اُنھوں نے خالی لفافوں پر مہر ثبت کرالی ہے۔ نہیں معلوم انہیں اُنھوں نے کون سے کاغذات بھیجے اور کہاں بھیجے۔ عدالت میں ایک درخواست پیش ہوئی ہے جو مکند لال کی طرف سے کسی گمنام شخص کے نام ہے۔ جس میں ایک روز کے جاری شدہ احکام کی تفصیل دی ہوئی ہے اُس فہرست میں صاف مرقوم ہے کہ اتنے احکام اُسکی ہدایت سے لکھے گئے ہیں۔ اور اتنے احکام اُسکی ہدایت سے۔ لیکن کہیں میری ہدایت سے لکھے ہوئے ایک حکم کا بھی حوالہ نہیں ہے۔ پس اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بدون میرے حکم کے جس نے جتنے احکام چاہے لکھدیے اور مجھے اُنکے خلاصہ تک سے اطلاع نہیں کی جاتی تھی۔ میں اور میرا سکرٹیری جان کے خوف سے کسی معاملہ میں کچھ نہیں کہتے تھے۔ ٹھیک یہی حالت اُن درخواستوں کی بھی ہے۔ جن پر میری دستی تحریر ہے۔ جب سپاہی یا مرزا مغل یا مرزا خضر سلطان۔ یا مرزا ابوبکر کو کچھ لکھوانا ہوتا تو وہ درخواستیں لے آتے۔ اور افسران فوج کو بھی ہمراہ لاتے اور احکام لکھنے کے لئے مجبور کرتے۔ وہ میرے ڈرانے کے لئے اکثر کہا کرتے تھے تاکہ میں اُنسے مرعوب ہوکر اُنکی خواہشات کی تعمیل کردیا کروں۔ کہ "جو اُنکی خواہشات کی تعمیل نہ کریگا اپنی حالت کے موافق سزا پائیگا"

علاوہ ازیں میرے ملازموں پر انگریزوں کے پاس خط بھیجنے اور سازش کرنے کی تہمت لگایا کرتے تھے۔ علی الخصوص حکیم احسن اللہ خاں۔ محبوب علی خاں اور ملکہ زینت محل پر سازش کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اور کہا جاتا تھا کہ اب اگر ایسا معلوم ہوا تو ہم انکو مار ڈالیں گے۔ اسی طرح ایک روز حکیم صاحب کا مکان لوٹ لیا اور بارادہ قتل اُنھیں مقید کر لیا تھا۔ بہزار دشواری اور میری منتیں کرنے پر اپنے ارادہ سے باز رہے۔ لیکن پھر بھی حکیم صاحب کو قید رکھا۔ اسکے بعد میرے دیگر ملازموں کو گرفتار کر لیا۔ مثلاً شمشیر الدولہ والدہ ملکہ زینت محل وغیرہ کو نیز اُنھوں نے کہا کہ وہ مجھے معزول کرکے میری جگہ مرزا مغل کو بادشاہ بنائیں گے۔ پھر یہ معاملہ سنجیدگی وانصاف سے قابل غور ہے کہ میرے پاس کسی قسم کی کونسی طاقت تھی یا اُن کو خوش رکھنے کا کونسا سبب میرے پاس تھا۔ افسران فوج یہاں تک سرچڑھ گئے تھے کہ ملکہ زینت محل کا مطالبہ کرتے تھے کہ میں اُن کو اُنکے حوالہ کر دوں تاکہ وہ اُنھیں قید میں رکھیں وہ کہتے تھے کہ ملکہ نے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے ہیں پس اگر مجھے پوری طاقت یا اختیار ہوتا تو کیا میں حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علیخاں کو مقید ہونے دیتا یا حکیم صاحب کا مکان لٹتے دیکھتا۔ باغی سپاہ نے ایک کورٹ قائم کیا تھا۔ جہاں تمام معاملات طے ہوتے تھے اور جن معاملات کو وہاں طے کیا جاتا تھا۔ اُنھیں یہ کونسل اختیار کرتی تھی۔ میں نے کبھی اُنکی کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ اُنھوں نے اسطرح بدون میری مرضی یا خلاف حکم صرف میرے ملازموں کو ہی نہیں لوٹا۔ بلکہ کئی میرے محلوں کو لوٹ لیا۔ چوری کرنا۔ قید کرنا اُنکے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اور جو جی چاہتا تھا کر گذرتے تھے۔ جبراً معززاہل شہر سے اور تجار سے جتنی رقم چاہتے تھے وصول کرتے تھے۔ اور یہ مطالبہ ذاتی اغراض کے لئے کرتے تھے۔ جو کچھ گذر رہا ہے وہ سب مفسدہ پرداز فوج کا کیا دھرا ہے۔ میں اُنکے قابو میں تھا۔ اور کیا کرسکتا تھا۔ وہ اچانک آپڑے اور مجھے قیدی بنالیا۔ میں لاچار تھا اور دہشت زدہ۔ جو اُنھوں نے کہا میں نے کیا۔ ورنہ اُنھوں نے مجھے کبھی کا قتل کر ڈالا ہوتا۔ یہ سب کو معلوم ہے۔ مجھے ایسی مایوسی ہوئی تھی کہ زندگی

سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ جبکہ میرے ماتحت عہدہ داروں کو بھی جانبری کی اُمید نہیں تھی اسی لئے
میں نے فقیری کا تہیّہ کر لیا تھا اور گیرُوے رنگ کی صوفیانہ پوشاک پہنی شروع کر دی تھی پہلے
قطب صاحب رح کی درگاہ وہاں سے اجمیر شریف اور اجمیر شریف سے بالآخر مکہ معظمہ جانیکا عزم
تھا۔ لیکن فوج نے مجھے اجازت نہیں دی۔ جس نے میگزین اور خزانہ لوٹا تھا۔ یہ سپاہ وہی تھی
جنہوں نے جو چاہا کیا۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ نہ اُن لوگوں نے کچھ لوٹ کا مال لاکر مجھے دیا۔
ایک روز یہی لوگ ملکہ زینت محل کا مکان لوٹنے کی نیت سے گئے تھے۔ مگر دروازہ توڑنے میں
کامیاب نہ ہو سکے۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ اگر وہ میرے ماتحت ہوتے یا میں اُنکی سازش میں
شریک ہوتا تو یہ باتیں کیوں ظہور پذیر ہوتیں۔ اس سب کے ساتھ ہی یہ بھی قابل غور ہے کہ کوئی شخص
غریب ترین انسان کی بیوی کا مطالبہ بھی یوں نہیں کرتا ہے "کہ لاؤ اسے مجھے دیدو میں قید کرونگا"
اور یہ باغی میری ملکہ کو قتل و قید کرنے کے لئے مجھ سے طلب کرتے تھے۔ حبشی قنبر کی نسبت یہ ہے
کہ اُسنے مجھ سے حج کرنے اور مکہ شریف جانے کی رخصت لی تھی۔ میں نے اُسے ایران نہیں
بھیجا۔ نہ میں نے شاہ ایران کو کوئی خط بھیجا۔ یہ قصّہ کسی نے غلط مشہور کیا ہے۔ محمد درویش کی
درخواست میری دستاویز نہیں ہے۔ کہ اُسپر بھروسہ کیا جائے۔ ممکن ہے کسی نے میرے یا میاں
عسکری صاحب کے دشمن نے وہ درخواست بھیجی ہو۔ لہذا اُسپر اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔ باغی فوج
کی عادتوں کی نسبت معلوم ہو کہ اُنھوں نے کبھی مجھے سلام تک نہیں کیا۔ نہ میرا کسی قسم کا ادب و
لحاظ کیا۔ وہ دیوان خاص و دیوان عام میں بیدھڑک جوتیاں پہنے چلے آتے تھے۔ میں اُن فوجوں
پر کیا اعتبار کرتا جنھوں نے اپنے ذاتی آقاؤں کو قتل کر دیا ہو جسطرح اُنھوں نے اُن کو قتل کیا۔
مجھے بھی مقید کر لیا۔ مجھ پر جور کئے۔ مجھے اپنے حکم میں رکھا۔ اور میرے نام سے فائدہ اُٹھایا۔ تاکہ
میرے نام کی وجہ سے اُنکے افعال مقبول ہوں۔ پس جبکہ اُن فوجوں نے اپنے ذاتی ذی وجاہت
صاحب فرمان افسروں کو مار ڈالا۔ میں بے فوج۔ بے خزانہ۔ بے سامان جنگ۔ بے توپخانہ

کیونکر انھیں روک سکتا تھا۔ یا اُن کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکتا تھا لیکن میں نے کبھی کسیطرح کی اُنھیں مدد نہیں دی۔ جب باغی افواج قلعہ کے پاس آئیں میری طاقت میں تھا میں نے دروازے بند کر دئے۔ میں نے قلعہ دار کو طلب کیا۔ اور جو کچھ گذرا من وعن بیان کر دیا۔ اور انھیں باغیوں میں جانے سے باز رکھا۔ میں نے لیڈیوں کے لئے دو پالکیاں اور دو توپیں قلعہ کے پھاٹک کی حفاظت کے لئے قلعدار اور ایجنٹ لفٹنٹ گورنر کی درخواست پر روانہ کر دیں۔ مزید برآں اسی شب کو تیز سانڈنی سوار کو جو کچھ ہنگامہ یہاں برپا ہوا تھا اُسکا اطلاعی خط دیکر لفٹنٹ گورنر آگرہ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا کیا۔ میں نے اپنی خود مختار مرضی سے کوئی حکم نہیں دیا۔ میں سپاہ کے اختیار میں تھا۔ اور اُنھوں نے جبرًا و قہرًا جیسا چاہا کرایا چند ملازمین جو میں نے رکھے تھے باغی دہلوائی فوجوں سے ڈر کر اور اپنی جان کے خوف سے رکھے تھے۔ جب یہ فوجیں فرار ہونے پر آمادہ ہوئیں تو میں موقع پاکر چپ چاپ قلعہ کے پھاٹک سے نکلا اور مقبرہ ہمایوں میں جاکر ٹھہر گیا۔ اُس جگہ سے میں ضمانتًا طلب کیا گیا کہ میری جان محفوظ رہیگی اور میں نے فورًا اپنے آپ کو گورنمنٹ کی حفاظت میں دیدیا۔ باغی فوجیں مجھے اپنے ہمراہ لیجانا چاہتی تھیں مگر میں نہ گیا۔ مذکورہ بالا جواب میرا خود تحریر کیا ہوا ہے۔ اور بلا مبالغہ ہے حق سے اصلا انحراف نہیں کیا ہے۔ خدا میرا عالم و شاہد ہے کہ جو کچھ بالکل صحیح تھا جو کچھ مجھے یاد تھا وہ میں نے لکھا ہے۔ شروع میں آپ سے حلفیہ کہا تھا کہ میں بغیر بناوٹ اور بغیر ملاوٹ کے وہی لکھوں گا جو حق اور راست ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی میں نے کیا ہے۔

دستخط بہادر شاہ بادشاہ

شاہی بیان کا تتمہ

مرزا مغل کے نام ایک حکم کا حوالہ دیتے ہوئے جسمیں سپاہ کے کردار کی شکایت اور میر

آخری ارادہ درگاہ خواجہ صاحب کو اور وہاں سے مکہ معظمہ جانے کا بیان ہے۔ میں اظہار کرتا ہوں کہ مجھے ایسے کسی حکم کا اجرا یاد نہیں۔ حکم زیر بحث برخلاف میرے دفتر کے قوانین کے اردو زبان میں ہے جہاں اس قسم کی ہر ایک تحریر فارسی زبان میں لکھی جاتی تھی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ یہ حکم کس نے اور کہاں تیار کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مجھے فوج سے بالکل عاجز آیا ہوا دیکھ کر اور میرے تارک الدنیا ہو کر فقیری لے لینے پھر مکہ معظمہ جانے کے خیال سے مرزا مغل نے یہ حکم اپنے دفتر میں لکھوایا ہوگا۔ اور میری مہر اُس پر ثبت کر دی ہوگی۔ بہر حال فوج سے میری ناراضگی اور میری پوری بے بسی کی جسکا میں پہلے ذکر کر آیا ہوں۔ حکم زیر بحث سے بھی تصدیق ہو سکتی ہے۔ دیگر دستاویزوں کے بابت جو اسکے ماسوا ہیں جیسے راجہ گلاب سنگھ کے مراسلات کی نقل یا بخت خاں کی درخواست پر میرے احکام اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے و مہر ثبت کئے ہوئے دیگر کاغذات جو کارروائی میں شامل ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے ان کی یاد نہیں ہے۔ بلکہ میں ابھی جیسا بیان کر چکا ہوں کہ افسران فوج نے بلا اطلاع جیسا چاہا لکھا اور اُس پر میری مہر ثبت کر دی اور مجھے یقین ہے کہ یہ بھی ضرور اسی قسم کے ہیں از بخت خاں کی درخواست پر ضرور مجھے حکم لکھنے کیلئے مجبور کیا گیا ہوگا۔ جسطرح دوسری درخواستوں پر لکھوایا کرتے تھے

مکرر دستخط بہادر شاہ

عدالت کا فیصلہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ جلا وطنی کا حکم صادر ہوا۔ اور فوجی پہرے میں ہندوستان سے خارج البلد کئے گئے۔ شہزادہ جواں بخت و زینت محل کے علاوہ ۴ از زن و مرد بادشاہ کے ساتھ روانہ ہوئے۔

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے	بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے ظفر
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی	خوشی سے آئے تھے روتے ہوئے چمن سے چلے

قیدیوں کا قافلہ جب کانپور سے گزرا تو ایک چشمدید گواہ کا بیان ہے کہ بادشاہ پالکی میں گیروا لباس

پہنے بیٹھے تھے۔ ۶۵ گورے اس سپنیں کے گرد تھے۔ دو پالکیاں اور ساتھ تھیں جس میں نواب زینت محل اور تاج محل وغیرہ بیگمات تھیں۔ دو تین گاڑیوں پر شہزادہ جواں بخت وغیرہ دوسرے ہمراہیاں تھے اور ان سب کی خوراک کے لئے آٹھ روپیہ مقرر تھے۔

کہ آئین جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

قید فرنگ اور وفات

۱۸۵۸ء کے ختم ہونے سے پہلے اکبر کا آخری وارث رنگون پہونچا۔ جہاز سے اترتے ہی گوروں کی حراست میں بندرگاہ سے صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلے میں گیا جو پرانی گھوڑ دوڑ کے میدان کے قریب موجودہ سڑک "وایل روڈ" پر واقع تھا۔

اس بنگلے کے گرد گوروں کا پہرہ ظفر کی زندگی تک رہا اور خرچ آب و نمک کے لئے صرف چھ سو روپیہ ماہوار ملتے رہے۔ انھوں نے سرکار انگریزی سے کسی امداد کی استدعا نہیں کی۔ فاقہ کشی اور غربت کی زندگی گوارا کی لیکن حمیت وغیرت ترک نہ کی۔ زینت محل کے پاس کچھ زیورات باقی تھے انھیں کو معاش کا ذریعہ بنایا۔ اور بدنصیب زندگی کی آخری سانسیں افلاس و تنگدستی میں گزار دیں۔ شاعری کا شوق رنگون میں بھی باقی رہا۔ انکی بعض دردناک نظمیں قید خانہ کی چار دیواری سے نکل کر دلی تک پہونچیں اور اب بھی سخن فہموں کے پاس محفوظ ہیں لیکن وہ نہ تو خود ان کو شایع کرتے ہیں۔ نہ نہ دوسروں کو ان کی زیارت سے بہرہ مند ہونے دیتے ہیں۔ مرحوم اڈیٹر صلائے عام دہلی کے پاس ایک نفیس نظم اسی دور مصیبت کی تصنیف کسی ذریعہ سے پہونچ گئی تھی اور اسکے کئی اشعار دلی والوں کی زبان پر آگئے تھے۔ لیکن باوجود اصرار اور تقاضے کے انھوں نے یہ نظم خاکسار مولف کو عنایت نہ فرمائی۔ وہ نظم نعت میں بطور مناجات کے تھی اور مدینہ میں موت نصیب ہونیکی تمنا کا اظہار تھا۔

کہا جاتا ہے کہ مندرجۂ ذیل غزل رنگون کی بیکسی اور کس مپرسی کی یادگار ہے۔ بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ زبان ظفر کی نہیں ہے لیکن اُنکے دیوان اول میں بھی ایک غزل اسی طرز کی موجود ہے اور اسکے اشعار حاشیہ[۱] پر درج کر دئے گئے ہیں۔

کون نگر میں آئے ہم کون نگر میں باسے ہیں   جائینگے اب کون نگر کو من میں اب ہراسے ہیں

دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا ہے   کون آنند کرے ہے واں اور رہتے کون اداسے ہیں

کیا کیا پہلو دیکھے ہمنے اُس پھلواری میں   اب جو پھول اُسمیں پھول کچھ اور ہی اسمیں باسے ہیں

دنیا ہے یہ رین بسیرا بہت گئی رہ گئی تھوڑی سی   اُنسے کہدو سو نجاویں نیند میں جو کہ نداسے ہیں

حسب ذیل اشعار بھی قید رنگون کی یادگار ہیں اور جذبات کی صحیح ترجمانی ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دلکا قرار ہوں   جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

میرا رنگ روپ بگڑ گیا میرا حسن مجھسے بچھڑ گیا   جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اُسی کی فصل بہار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں   کوئی آکے شمع جلائے کیوں میں وہ بیکسی کا مزار ہوں

یہ شعر بھی اُسی عہد کی حسرت و مصیبت کی تصویر ہے!۔

نہ دبایا زیر زمیں انھیں نہ دیا کسی نے کفن انھیں   نہ ہوا نصیب وطن اُنھیں نہ کہیں نشان مزار ہے

غرض قید خانہ کے تنگ و تاریک کمرے میں وہ موت کا انتظار کرتے تھے۔ چہل قدمی یا ہوا خوری کے لئے بہت ہی کم باہر نکلتے اور بیشتر وقت یاد خدا۔ تسبیح و استغفار میں صرف کرتے تھے۔ آخر کار اُنکی دعا قبول ہوئی اور ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو قید فرنگ اور قید حیات دونوں سے آزاد ہو گئے۔

---

[۱] (از جلد اول دیوان ظفر۔ ردیف نون)

جن گلین میں پہلے دیکھیں لوگن کی رنگ رلیاں تھیں   پھر دیکھا تو ان لوگن بن سونی پڑی وہ گلیاں تھیں

ایسی آنکھیاں میچے پڑے ہیں کروٹ بھی نہیں لے سکتے   جنکی چالیں البیلی اور چلنے میں چھل بلیاں تھیں

خاک کا اُن کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے   ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس کس چاؤ سے پلیاں تھیں

ندا در داد ہاتف بہر سالش   بہادر شاہ از دنیا برفت آہ

ایضاً

چراغ دہلی جلوس کا سال تھا سو اب بھی مطابق اسکے
سروش غیبی نے سال رحلت کہا بجھا ہے چراغ دہلی

سکرات موت کے وقت سوائے زینت محل۔ جواں بخت۔ انکی بی بی اور ایک خورد سال بچی کے کوئی موجود نہ تھا۔ حکام کی اجازت سے تجہیز و تکفین کر کے اُسی بنگلہ کے احاطہ میں دفن کر دیا۔ کچی قبر تھی۔ ایک بیری کا درخت سرہانے لگا تھا اور اُسی سے مدت تک مرقد کا نشان رہا۔ زینت محل کچھ مدت تک اسی بنگلہ میں فروکش رہیں۔ بعد ازاں دوسرے مکان میں حکماً منتقل کی گئیں۔ پابند وضع شوہر کی وفات سے پانچ سال تک اُنھوں نے بھی انگریزی حکومت سے کوئی امداد قبول نہ کی۔

آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج   احتیاج است احتیاج است احتیاج

مجبور ہو کر ۱۸۶۷ء سے پانچسو روپیہ ماہوار کی پنشن منظور کر لی۔ اور اسی قدر وظیفہ مرزا جواں بخت کا بھی مقرر ہو گیا۔ شہزادے نے غربت و بیکسی میں بمقام مولمین (ملک برما) ۱۸۸۴ء میں انتقال کیا۔ آج تک قبر کا پتہ نہیں چلا ہے۔

غم نصیب زینت محل محلاتی عیش و عشرت کا غم و اندوہ سے کفارہ ادا کرنیکے بعد ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو دنیا سے رخصت ہوئیں اور پرانے بنگلے کے احاطے میں مظلوم شوہر کی قبر کے پاس دفن کی گئیں۔

وہ احاطہ ایک یوروپین مسٹر ڈاسن کو جنکا برما کی مشہور ڈاسن بنک کمپنی سے تعلق تھا ٹھیکے پر دیدیا گیا۔ صاحب بہادر کو مزار پر فاتحہ پڑھنے والوں اور چراغ بتی کے لیئے خادموں کی آمد و رفت ناگوار ہوئی۔ مقبرے کا راستہ بند کر دیا۔ مرقد مبارک کے ایک طرف ٹینس کھیلنے کا میدان تھا اور دوسری طرف گھوڑے سدھانے کا چکر۔ چند روز میں قبروں کا نشان بھی ناپید ہو گیا۔ اور روشن ضمیر ظفر کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

پس مرگ قبر پرائے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے　　وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اُسے ٹھوکروں سے اُڑا دیا

بیسویں صدی کے آغاز میں ایک عقیدت مند پرستار ملک وملت عبدالسلام نام دہلی مرحوم کے آخری تاجدار کا مزار تلاش کرتے ہوئے بہزار مشکل اس احاطے میں داخل ہوئے۔ تیری کا درخت موجود تھا۔ واقف کاروں نے نشان دیا کہ اسی درخت کے قریب بادشاہ اور اُنکی بیگم کی قبریں فرض کرلینا چاہیئے۔ غیرت مند و فاکیش نے حکومت برہما سے خط و کتابت کی۔ اخباروں میں مضامین لکھے، ہندوستان سے لیکر لندن تک دردمندوں کے قلوب زخمی کردیے تب اس مقام پر ایک کتبہ انگریزی زبان میں نصب کیا گیا جسکا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

" دلی کا معزول بادشاہ بہادر شاہ، ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں مرا اور اس جگہ کے قریب دفن ہوا "

چند ماہ کی مزید کوشش کے بعد اسی پتھر پر زینت محل کی تاریخ وفات بھی کندہ کردی گئی، کئی سال کی مسلسل سعی بلیغ سے یہ حاصل ہوا کہ گورنمنٹ نے مسلمانان برما کو قبر کا نشان دوبارہ بنانیکی اجازت دی۔ اب دونوں قبروں کو ملاکر ایک تعویذ بنا دیا گیا ہے۔ لوہے کا کٹہرہ اور ٹین کا سائبان ہے۔ بہادر شاہ کے پوتے سکندر بخت قبر کی مجاوری کرتے ہیں اور مسلمانوں کو فاتحہ خوانی کیلئے آمد ورفت کی اجازت ہے۔ اس غریب شہزادہ کا ذریعہ معاش سوائے نذر ونیاز کے کچھ نہیں ہے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے　　کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

ظفر کی شاعری پر ریویو

ظفر کے عنفوان شباب کے وقت اُردو شاعری ترقی کے مدارج طے کر رہی تھی۔ مرزا مظہر جان جاناں، میر درد۔ مرزا رفیع سودا کا دفتر زمانہ الٹ چکا تھا۔ میر تقی زندہ تھے لیکن بہت بوڑھے ہوچکے تھے مصحفی۔ انشا۔ جرأت لکھنؤ کو زعفران زار بنائے تھے اور دلی میں شاہ نصیر

عبدالرحمٰن خاں احسانؔ میر نظام الدین ممنونؔ اور حکیم قدرت اللہ قاسمؔ کی دھوم تھی شاہ نصیرؔ کا مرتبہ اپنے ہم عصر شعراء دلی سے اعلیٰ تھا۔ دربار سلطانی میں رسائی تھی۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق شاہ عالم شعر و سخن میں اُن سے مشورہ کرتے تھے اور اسی سلسلہ سے ایک بار انھوں نے جاڑے کے موسم میں ایک قطعہ بطور حسن طلب بادشاہ کے حضور میں گذرانا اور صلہ حاصل کیا تھا۔ جسکے دو شعر صاحب آبحیات نے لکھے ہیں:

بچائے گا تو ہی اے میرے اللہ　　کہ جاڑے سے پڑا ہے بے ڈھب پالا

پناہ آفتاب اب مجھ کو بس ہے　　کہ وہ مجھ کو اُڑھا دے گا دوشالا

شکوہ الفاظ چستی ترکیب۔ برجستہ تشبیہات اور مضمون آفرینی میں اپنے ہمعصروں سے فائق تھے مرزا ابو ظفر نے انھیں کا تلمذ اختیار کیا اور آخری بادشاہ کی استادی کا شرف سب سے پہلے اُنھیں کو حاصل ہوا۔ شاہزادے کو موسیقی سے شوق۔ فنون لطیفہ سے ذوق تھا طبیعت موزوں تھی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ دہلی کے تمام باکمال شعراء مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسمؔ، میر قمر الدین منتؔ۔ میر نظام الدین ممنونؔ وغیرہ اُنکی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اپنے کلام سناتے۔ قوت فکر کی بلند پروازی دکھاتے اور ظفر کے جوہر کمال پر صیقل کرتے تھے۔

حکیم ثناء خواجہ میر دردؔ کے شاگرد تھے۔ مگر زبان کی صفائی اور بیان کی لطافت نے اُستاد بنا دیا۔ فرماتے ہیں:۔

دل تھامتا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ　　ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

حسرت ذرا بھی دل کی نہ نکلی ہزار حیف　　نکلا اِدھر وہ گھر سے اُدھر جی نکل گیا

آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں　　بھولے سے اسنے یاد کیا ہو عجب نہیں

حافظ احسان استاد سلاطین زمن کے لقب سے مشہور تھے۔ قلعہ کے تقریباً تمام شہزادے

اُنکے شاگرد تھے۔ اکبر ثانی کو شعر و سخن سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ مگر کبھی غزل یا سلام کہتے تو اُنھیں کو دکھاتے تھے۔ اسی کی طرف قطعۂ ذیل میں اشارہ ہے۔

ہوں شہِ ہند کا اُستاد یہ ہے فخر مجھے — شہرہ میرا تو شہا تا شہِ ایران گیا

عرض غماز پذیرا جو ہوئی حق میں مرے — کیا گیا میرا مگر اُسکا ہی ایمان گیا

حکم والا یہ ہوا قلعہ میں احسان نہو — سنکے اس بات کو اک شہر کا اوسان گیا

اے شہنشاہِ جہاں قدر شناسِ حساں — خلق کیا کہو گی گو حکم کو میں مان گیا

شہر وہ کیا ہے کہ جس شہر میں احسان نہو — قلعہ وہ کیا ہے کہ جس قلعہ سے احسان گیا

ظفر کی سرکار سے وظیفہ کا احسان اخیر وقت تک قائم رہا۔ ایک مرتبہ معینہ رقم کے ملنے میں دیر ہوئی تو احسان نے حسب ذیل قطعہ فی البدیہہ تصنیف کر کے شکار ماہی کے موقع پر پیش کیا۔

صید ماہی و صید دل شاہا — خوب ہے اور کچھ نہیں معیوب

جال ہوں اور شکار مچھلی کا — یعنی ڈوبے کا ہے نکالنا خوب

قطب صاحب تھے جب حضور گئے — وہ دوہا گیا ہے میرا ڈوب

اُس کو بھی حکم ہو نکل آئے — صبر کب تک ہو میں نہیں ایوب

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ علاوہ علم طب میں مہارت رکھنے کے شعر و سخن کے بھی نباض تھے شعرائے اُردو کا ایک بسیط تذکرہ اُنکے یادگار ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہمیں بھی رخصت سیر چمن ہو ٹک صیاد — کہ اب کے شور ہے ظالم بہار آنیکا

میر قمر الدین منّت کا کیا کہنا دہلی کے سپہر سخن پر بارھویں کا چاند تھے۔

دریں عمر دہ ثنوی گفتہ ام — بآئیں طرز نوی گفتہ ام

چو اشعار من در عدد می رسد — شمار قصائد بصد می رسد

بود شعر من در غزل سی ہزار — ز یا نصد رباعی گرستم شمار

میرنظام الدین ممنونؔ منت کے سے کہنہ مشق اُستاد کے بیٹے تھے۔ اکبر ثانی کی سرکار سے فخر الشعرا کا خطاب پایا۔ زبان کی حلاوت مضامین کی تازگی پر جسقدر ناز کرتے بجا تھا۔

رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت　　صلح کیجئے بس لڑائی ہو چکی

یہ نہ جانا تھا کہ اس محفل میں دل رہ جائیگا　　ہم یہ سمجھے تھے چلے آئینگے دم بھر دیکھ کر

شاہزادہ کا خلق وسیع تھا اور تواضع انکسار کے جوہر قسام ازل نے عنایت کئے تھے احباب کی خاطر۔ ہم صحبتوں کی مدارات زبان کی شیرینی سے خلائق کے دلوں پر بادشاہی کرتے تھے طبیعت حاضر۔ شعر دسخن کا شستہ مذاق۔ سرآمد شعرائے عصر شاہ نصیر کی شاگردی سونے پر سہاگہ۔ ولی عہدی کا مقدمہ گورنمنٹ میں دائر ہوا۔ باپ ناراض ہوئے۔ شاہی خزانہ سے بجائے دس ہزار منصب ولی عہدی کے صرف پانچسو روپیہ بطور مدد معاش کے ملنے لگا۔ اخراجات کی زیادتی۔ آمدنی کی قلت حریف آواز سے کستے تھے شکستہ دلی نے کلام میں درد پیدا کیا۔ شاعری پر رنگ و روغن چڑھا۔ تقاضائے سن سے کاروبار محبت بھی جاری تھا۔ دیوان تیار ہو گیا۔

ہاتف غیبی سے کل آئی ظفر مجھ کو ندا　　فکر میں تاریخ کی رہتا تو کیوں حیران ہے

دو ہیں صد رشک چمن مصرع یہ مجھسے ڈھل گیا　　روز اب رنگین یہ اپنا سرسبز دیوان ہے

یہ دیوان رشک گلشن کیوں نہو گلہائے مضموں سے

کہ اس کا جو ورق ہے سو خیابان معانی ہے

ظفر یہ بے تامل مصرعۂ تاریخ لکھ اس پر

مرا اب یک قلم دیوان بستان معانی ہے

دیوان اول فی الحقیقت گلہائے مضامین سے رشک گلشن ہے۔ اور اسکا بیشتر حصہ

شاہ نصیر کا اصلاح کردہ ہے ۔ وہی زبان ہے وہی محاورات ۔ اور وہی سنگلاخ زمینیں شاہ نصیر دیوان چندولال[1] کی سخاوت کا شہرہ سنکر عازم دکن ہوئے تو ولی عہد کے کلام پر اصلاح اپنے شاگرد میر کاظم حسین بیقرار کے سپرد کر گئے جنکی وساطت سے شیخ ابراہیم ذوق قلعہ میں پہونچے ۔ اور شہریار فصاحت کی صحبت کیمیا اثر میں بیٹھکر اقلیم شہرت کو تسخیر کرنے اور ملک الشعرائی کا تاج پہننے کی قابلیت حاصل کی ۔

مرزا ابوظفر بوجہ مقدمۂ ولی عہدی معتوب تھے ۔ بیقرار کو بیش قرار تنخواہ نہیں ملسکتی تھی اتفاق سے جان الفنسٹن سکار پور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہدنامے کرتے چلے انھیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت وعلمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو میر کاظم حسین نے اس عہدہ پر سفارش کیلئے ولی عہد سے شقہ چاہا ۔ میرزا مغل بیگ ان دنوں میں مختار کل تھے اور ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ جسپر ولی عہد کی زیادہ نظر عنایت ہو اُسے کسی طرح سامنے سے سرکاتے رہیں اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقہ سفارش آسانی سے حاصل ہو گیا اور وہ چلے گئے ۔

چند روز کے بعد ایک دن شیخ ابراہیم جو ولی عہد کے یہاں گئے تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں ۔ اُنھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے "کہ میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے ۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا" غرض اُسیوقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے بنا دو ۔ یہ

---

[1] دیوان چندولال قوم کے کھتری دربار آصف جاہی میں ہفت ہزاری منصب رکھتے تھے اور "راجہ رایان" "مہاراجہ بہادر" کے خطاب سے سرفراز تھے ۱۲۱۹ھ میں پیشکاری کا عہدہ پایا لیکن وزارت اور دیوانی کے اختیارات قبضۂ اقتدار میں تھے ۔ اُنکی سخاوت اور فیاضی ضرب المثل تھی ۔ حیدرآباد میں لکھنؤ کے آصف الدولہ تھے ۱۲۶۰ھ میں خدمت پیشکاری سے مستعفی ہوئے اور ۱۲۶۱ھ میں ۸۲ برس کی عمر پاکر زندگی سے استعفا دیا ۔ فارسی اُردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے ۔ اور شاداں تخلص تھا شعرا اور علما کی خدمت گذاری نے حیات جاوید عطا کی ۔

وہیں بیٹھ گئے ۔ اور غزل بنا کر سنائی ۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو ۔ غرض چندروزہ اصلاح جاری رہی اور آخر کار سرکار ولی عہدی سے للعہ مہینہ بھی ہو گیا اور شیخ مرحوم ولی عہد کے اُستاد ہو گئے ۔

میرا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے جب آبحیات کے جام میں یہ زہر ہلاہل دیکھتا ہوں کہ " بادشاہ کے چار دیوان ہیں ۔ پہلی کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں ۔ کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی ہیں ۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سراپا ذوق کے ہیں جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے ۔ ان کا نظام و سرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں ۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمھارا زمین کا بادشاہ ہے ۔ طرحیں خوب نکالتا ہے ۔ مگر تم سرسبز کرتے ہو ورنہ شورزار ہو جائے ۔ مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا ۔ کوئی ڈیڑھ مصرع ۔ کوئی ایک ۔ کوئی آدھا مصرع ۔ فقط بحر اور قافیہ معلوم ہوتا تھا ۔ باقی بخیر ۔ یہ اُن ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے ۔"

یا

" تاریخ کی کمائی سب بادشاہ کے حصہ میں آئی ۔ کیونکہ اکثر انھیں کی فرمائش سے کہتے تھے اُنھیں کا تخلص ہوتا تھا ۔ نوجوان ولی عہد طبیعت کے بادشاہ تھے ۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی "۔

فقیر اسیر شمس العلما کی انشاپردازی کا عاشق ۔ اُنکی سحر طرازی کا شیدا اور جادو نگاری کا مفتون ہے ۔ اسکو کیا مجال کہ سورج کو چراغ دکھانے کی جرأت کرے ۔ لیکن اہل شرع کا فتویٰ ہے کہ پیش امام سے قرآن کے پڑھنے میں سہو ہو تو مقتدی کو لقمہ دینا ہی مناسب ہے ۔

مولانا کو خیال نہیں رہا کہ شاگردی اور اُستادی کا ذوق سے تعلق شروع ہونے کے وقت نہ تو مرزا ابوظفر " نوجوان " تھے اور نہ شیخ ابراہیم " جوان " مرزا کی عمر اُسوقت ۳۳ سال سے کم نہ تھی اور " نشاط عمر باشد تا بہ سی سال " کے بحر طوفان خیز سے پار ہو چکے تھے ۔ شیخ آزاد کی تحقیق کے مطابق

صرف ۱۰یا ۱۱ برس کے تھے اور "عقل داڑھ" بھی شاید نہیں نکلی تھی۔

سندھ اور کابل وغیرہ سرحدی ممالک سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدنامے ۱۸۰۸ء میں ہوئے جو ۱۲۲۴ھ کے مطابق ہے۔ مولانا کو تسلیم ہے کہ ذوق نے ولی عہد کی غزلوں پر اصلاح دینا اُسوقت شروع کی جب میر کاظم حسین جان الفنسٹن صاحب کے ساتھ عہدناموں کی تکمیل کیلئے سرحدی علاقوں کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ظفر کا مطبوعہ کلیات کہتا ہے کہ مرزا کا پہلا دیوان ۱۲۲۳ھ میں مرتب ہو چکا تھا۔ اور ہاتف غیب نے قطعہ تاریخ کہکر ظفر کا تخلص ڈالدیا تھا۔ جو اسوقت تک چشم چمان سے محفوظ۔ دیوان اول کی ردیف "یا" میں موجود ہے۔

باوجودیکہ بادشاہ "ایجاد کا بادشاہ تھا" "طبیعت کا بادشاہ تھا" "زمینوں اور طرحوں کا بادشاہ تھا" "مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا بھی ہوتا تھا"۔ لیکن اُستاد کی قدر و منزلت قائم رکھنے کے لئے بے محابا ارشاد ہوتا ہے کہ "پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سراپا ذوق کے ہیں"۔ مظلوم شاگرد کا دیوان چہارم عاجزی سے دریافت کرتا ہے کہ کیا سند حب ذیل اشعار اور وہ غزلیں جنھیں یہ شامل ہیں ذوق مرحوم نے اپنی زندگی میں تصنیف کر کے ظفر کا تخلص ڈالدیا تھا۔

گیا لطف سخن تو ذوق ہی کے ساتھ دنیا سے	جو تھوڑا سا رہا ہے اے ظفر کچھ تو ہمیں تک ہے
بے ذوق زرا لطف نہیں شعر و سخن میں	اس رمز نہانی کو کوئی پوچھے ظفر سے
تیرا مذاق شعر ظفر جانتا ہے کون،	اُستاد ذوق تھا ترے واقف مذاق سے
بعد اُستاد ذوق تیرے سوا،	رکھتا فہمید شعر تر ہے کون
لکھ اسی قافیہ میں اور غزل	تجھ سے بہتر اب اے ظفر ہے کون

مؤلف خمخانۂ جاوید کا بیان ہے کہ ذوق کی خبر مرگ سنکر بادشاہ نے جشن ملتوی کیا۔ بار بار مرحوم کے حقوق جان نثاری یاد کر کے افسوس فرماتے رہے۔ اور قطعۂ ذیل اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا۔

شبِ چار شنبہ بماہِ صفر | بحکم خداوند جان داد ذوق
ظفر روئے اردو بناخن زغم | خراشید و فرمود اُستاد ذوق

+۱ ۱۲۷۱ = ۱۲۷۲

کیا یہ قطعہ بھی ذوق مرحوم تصنیف کرکے دے گئے تھے۔ اور سُنیئے ذوق کی قبر دلی میں موجود ہے۔ اور قطعہ ذیل مزار پر کندہ ہے۔

طوطیٔ ہند حضرت اُستاد ذوق نے | لی گلشن جہاں سے جو باغ جناں کی راہ
سالِ وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر | کہہ ذوق جنتی ز سر بخشش الٰہ

کیا یہ قطعہ بھی ذوق مرحوم ظفر کے پاس امانت رکھ گئے تھے۔

کلیات ظفر کا بیشتر حصہ ذوق کا اصلاحی ہے اسمیں کلام نہیں ظفر کی شاعری کو ذوق کی تربیت سے فروغ ہوا اسمیں شک نہیں لیکن فیاضی اور فراخ دلی سے ظفر کی عمر بھر کی کمائی ذوق کے حوالے کر دینا ویسا ہی ظلم ہے۔ جیسے مثنوی گلزار نسیم کو آتش کی تصنیف بتانا۔ یا گلزار داغ کو مرزا فخرو شہزادہ کی طرف منسوب کرنا۔

ذوق کا دیوان موجود ہے۔ بندش کی چستی۔ طرز بیان کی دلآویزی مضامین کی تازگی الفاظ کی نشست ثابت کرتی ہے کہ وہ اُستاد کا کلام ہے ظفر کے کلیات میں کمزوریاں ہیں۔ اور مضامین نو بنو کا قحط ہے۔ اس کو ذوق کی طرف منسوب کرنا۔ ملک الشعرا کی شہرت میں داغ لگانا ہے۔ البتہ جو درد و افسردگی ظفر کے نغموں میں ہے اُس کا اُستاد کے خزانہ میں نشان نہیں،

نہ خون دل میں مرے اور نے شراب میں فرق | نہ میرے سینۂ بریاں میں اور کباب میں فرق
نہ میرے اشک میں اور تار چنگ میں دوری | نہ میرے نالہ میں اور نغمۂ رباب میں فرق
نہ لعل اور پارۂ دل میں مرے تفاوت کچھ | نہ آنسوؤں میں مرے اور دُر خوش آب میں فرق
نہ داغ سینہ میں اور آفتاب میں ہے دوئی | نہ درد دل میں مرے اور کچھ سحاب میں فرق

نہ سوز سینہ میرا در برق میں ہے فرق ظفرؔ
نہ کچھ ہے پارہ میں اور دل کے اضطراب میں فرق

دل کو دیتا ترا مہجور دلاسے یوں ہے
آج ہی وصل ہو اُمید خدا سے یوں ہے

یار تھا گلزار تھا مے تھی فضا تھی میں نہ تھا
لایق پابوس جاناں کیا حنا تھی میں نہ تھا

منشی کریم الدین مرحوم نے تذکرہ شعراء اردو موسوم بہ "طبقات شعراء ہند" ۱۸۴۷ء میں لکھا اُسوقت ظفرؔ اور ذوقؔ دونوں موجود تھے۔ وہ ذوقؔ کی بابت تحریر کرتے ہیں۔

"فن شعر میں ابتدائے عمر سے مصروف ہیں مگر حالت صبا سے آجتک یہ عادت طبیعت میں متمکن ہے کہ جو شعر کہتے ہیں کسیکو نہیں دیتے ہیں بادشاہ کے اُستاد ہیں۔ اصلاح شعر کی بادشاہ کو دیتے ہیں۔

جب ذوقؔ کی بابت اُنکے ہم عصروں کا بیان ہے کہ "وہ اپنا شعر کسیکو نہیں دیتے تھے"۔ تو شمس العلما آزاد کا یہ بے سروپا افسانہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے ساڑھے تین دیوان ظفرؔ کی طرف سے تصنیف کر دئے۔

ظفرؔ کی بابت منشی کریم الدین لکھتے ہیں۔

"شعر ایسا کہتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں اُنکے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ابراہیم ذوقؔ سے اصلاح لیتے ہیں تیرہ چودہ برس کا عرصہ ہوا کہ تخت نشین ہوئے۔ ابتدا میں ولی عہد تھے اُن ایام میں بھی اُنکے شعر بہت اچھے ہوتے تھے۔ تمام ہندوستان میں اکثر قوال اور رنڈیاں اُنکی غزلیں اور گیت اور ٹھمریاں گاتے ہیں۔ ہر ایک قسم کے شعر ہیں۔ ایک قصیدہ اُنھوں نے مدح پیغمبر خدا میں کہا ہے داخل تذکرہ کرتا ہوں"۔

یہ قصیدہ تبرکاً نقل کیا جاتا ہے۔

اے سرورِ دو کون شہنشاہ ذی الکرم
سرخیل مرسلین شفاعت گر اُمم

موکب ترے ملایک مرکب ترا براق
مولد ترا ہی مکہ و معبد ترا حرم

رنگ ظہور سے ترے گلشن رخ حدوث | نور وجود سے ترے روشن دل قدم

ہوتا کبھی نہ قالب آدم میں نفخ روح | بھرتا اگر خدا نہ محبت کا تیری دم

کرتا تھا جس سے مردہ کو زندہ دم مسیح | تھا شمہ تیرے خلق کا وہ اے نکو شیم

تو واں سریر اوج رسالت پہ جلوہ گر | آدم جہاں ہنوز پس پردۂ عدم

کرتا ہے تیرے اسم مبارک کو دل پہ نقش | اسواسطے عزیز جہاں ہو گیا درم

اے معدن کرم تیری ہمت کے روبرو | کمتر ہے سنگریزے سے قدر نگین جم

صدقے زمیں کے ہوتا نہ پھر پھر کے آسماں | رکھتا سر زمیں نہ اگر اپنا تو قدم

محروم تیرے دست مبارک سے رہ گیا | کیونکر نہ چاک اپنا گریباں کرے قلم

(سبحان اللہ۔ سبحان اللہ)

عالم کو تیرا نور رہا باعث ظہور | آدم ترے ظہور سے ہے مظہر اتم

ہیں زائران روضۂ اقدس ترے جہاں | آئے ہے پائے بوس کو واں روضۂ ارم

واللیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا | والشمس ہے تیرے رخ پرنور کی قسم

قرآں میں جبکہ خود ہو ثنا خواں ترا خدا | کیا تاب پھر قلم کو جو کچھ کر سکے رقم

تیری جناب پاک میں ہے یہ ظفر کی عرض | صدقے سے اپنی آل کے اے شاہ محتشم

صیقل سے اپنے لطف و عنایت کے دور کر | آئینہ ضمیر سے میرے غبار غم

پہنچا نہ آستان مقدس کو تیرے میں | اس غم سے مثل چشمہ ہوئے میرے چشم نم

پر خاک آستاں کو تری اپنی چشم میں | کرتا ہوں سرمہ میل تصور سے دمبدم

اس قصیدہ کے بعد ایک غزل بادشاہ کی نقل کی ہے اور لکھا ہے "یہ ایک غزل بادشاہ کی بہت اچھی ہے۔ تیمناً داخل تذکرہ کرتا ہوں"۔

ہیں یہاں رنج کے آثار خوشی کے باعث | اشک آنکھوں سے ٹپکتے ہیں خوشی کے باعث

عجب آیا ہمیں عالم نظر اللہ اللہ — دیکھیں ان دانتوں میں رنگیں جو مسی کے باعث

جان آجائے جو مرغان قفس تک صیاد — بوئے گل آئے نسیم سحری کے باعث

تم جو غصہ ہو تو غصہ میرے سر آنکھوں پر — پر بشرطیکہ نہ ہو اور کسی کے باعث

منشی احمد حسین سحر نے ۱۲۶۱ھ میں تذکرہ "بہار بیخزاں" مرتب کیا۔ اُسوقت بھی ذوق وظفر دونوں زندہ تھے۔ وہ ظفر کی بابت لکھتے ہیں "ظفر تخلص مرزا ابو ظفر بادشاہ دہلی بفن شعر میلے ومناسبتے تمام دارد۔ ابراہیم ذوق از مخصوصان حضرت اوست۔ وافکار ایشاں باصلاح اوچوں گوہر آبدار اند۔"

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے تذکرہ "گلشن بے خار" ۱۲۵۰ھ میں تمام کیا۔ اُسوقت مرزا ابو ظفر ولی عہد تھے۔ محاسن اخلاق کی بابت لکھتے ہیں کہ "بہ اکثر صفات موصوف وبہ محامد مکارم معروف۔ دراکثر خطوط دستگاہے شائستہ دارد" شاعری پر ریویو کرتے ہیں "بااین فن بسیار مالوف است شیخ ابراہیم ذوق از مائدۂ نعمتش ذلہ ربا و وظیفہ خوار است۔ وافکار ایشان بحک واصلاح او درست وہموار۔" غور کیجئے سحر و شیفتہ دونوں ظفر کے ہمعصر ہیں ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ظفر کو فن شعر سے "میل ومناسبت تمام ہے"۔ دوسرے رقم پرداز ہیں کہ ظفر فن شعر سے "بسیار مالوف" ہیں۔ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ ذوق ظفر کے افکار پر اصلاح دیتے ہیں۔ مگر شمس العلماء نصف صدی کے بعد روشنی ڈالتے ہیں کہ ذوق غزلیں تصنیف کر کے ظفر کا تخلص ڈال دیا کرتے تھے۔

شیفتہ کی سخندانی مسلم ہے۔ اُنھوں نے ظفر کے چند اشعار اپنے تذکرہ میں نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ "از اشعار آبدار ایشان است"۔ وہ اشعار ضرور سننے کے قابل ہونگے۔

ضبط فریاد کروں گریہ کو روکوں لیکن — دل بیتاب کو تھاموں یہ نہیں ہوسکتا

اب بھی وہ آنکھ تری آئینہ رو ہے کہ نہیں — اگلے طوروں پہ خدا جانیئے تو ہے کہ نہیں

دل دیکے انکو ایسی اذیت ہوئی ہیں — اب دل کبھی نہ دینگے نصیحت ہوئی ہیں،

پی لاکھ بار صہبا کی لاکھ بار توبہ — اب کر چکا ہیں توبہ توبہ ہزار توبہ

قاصد نہ سک چلا لیکے جو دل کا پیغام — کیا ظفر اس سے ملاقات کی پھر ٹھہرائی

جفا کی آپکی باعث وفا ہماری ہے — خطا تمھاری نہیں ہے خطا ہماری ہے

جنوں میں کیا میرے پیوند پیرہن کو لگے — کہ ایک تار بھی چھوڑا رہو تو کفن کو لگے

تذکرہ بزم سخن میں ظفر کی شاعری پر مختصر الفاظ میں بہترین ریویو ہے:۔

"در سخن پایۂ ارجمند داشت ۔ گفتارش اگرچہ سادہ پرکار ہست اما ہمہ اش خاطر سکار ست محاورہ گوئی ازاں ادست و معاملہ نویسی زیر فرمان او"

دور جدید کے اول نقاد نظم ۔ خواجہ الطاف حسین حالی اپنے دیوان کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں ۔

"ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارا اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے ۔ مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں ۔ صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں ۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔"

دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ ظفر اور ذوق کا طرز بیان جدا جدا ہے اور کلیات ظفر ذوق کا دیوان نہیں ہے ۔ مؤلف تذکرہ گل رعنا لکھتے ہیں ۔

"ذوق پھر بھی ذوق ہیں ظفر کے اُستاد ۔ اُنکے کلام کی رنگینی ۔ ترکیب کی چستی ۔ مضمون کی بندش ۔ جوش و خروش اُنکی باتیں اُنکے ساتھ ہیں ظفر کے یہاں جو سامان نظر آئیگا وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا ۔ محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملیگی ۔ مگر جوش و خروش کی جگہ دل و جگر کے ٹکڑے حروف والفاظ بنکر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ جگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے

اب اُنھیں ظفر کا سمجھو یا ذوق کا"

کلام ظفر پر ان باکمال بزرگوں کی رائیں نقل کرنیکے بعد اپنے خیالات کا اظہار چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ جو سخن فہم کلیات ظفر۔ و نصیر۔ ذوق و غالب بالاستیعاب پڑھیگا وہ علیٰ رغم انف آزاد تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ ظفر کے اشعار اُنھیں کے افکار عالی کا نتیجہ ہیں اور اُنکے اساتذہ کی طرف منسوب نہیں کئیے جا سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ظفر کو میر و سودا۔ مصحفی و آتش۔ مومن و غالب سے کوئی نسبت نہیں۔ ابتدائی کلام میں تقلید ناسخ کی ناکام کوشش ہے لیکن مضمون آفرینی نہو تو خارجی شاعری میں سوائے ضلع جگت کے کیا رہ جاتا ہے۔

کلیات کے ہر ورق پر جرأت کی سی معاملہ بندی نمایاں ہے اور غزل کا موضوع بھی دراصل واردات محبت کا بیان ہے لیکن بندش میں سستی یا خیالات میں ابتذال ہو تو ایسی داخلی شاعری سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔

دنیا کے عبرت انگیز تماشوں اور زندگی کے حسرت ناک نشیب و فراز نے کلام میں سُوز و گداز پیدا کر دیا ہے لیکن یہ تاثیر اُسی وقت تیز ہوگی جب بتا دیا جائے کہ یہ شعر ظفر کا ہے مثلاً۔

تر ا گھر میرا کاشانہ تھا اب ہے غیر کا مسکن　　تسلط زاغ نے پایا ہما کے آشیانے پر

اگر شاہ نصیر یا ذوق کی طرف منسوب ہو تو معمولی شعر ہے لیکن ظفر کی زبان سے عبرتناک مرقع اور دردناک مرثیہ ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بہادر شاہ کا کلام پانچ خاص وصف سے ممتاز ہے۔ پہلا وصف یہ ہے کہ وہ سنگلاخ زمینوں کے بادشاہ ہیں اور اپنی دشوار پسندی پر خود ناز کرتے ہیں۔

ظفر مشکل پسندی تیری سی اب کسکو آتی ہے　　سخنور دیکھ کر یہ طرز مشکل ہاتھ ملتا ہے

بے لطف قافیے خشک ردیفوں کے ساتھ ایسی خوش اسلوبی سے نظم کرتے ہیں کہ زبان سے بے ساختہ تعریف نکلتی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ اس "کوہ کندن" میں وہ شاہ نصیر اور اُستاد ذوق سے گوئے سبقت لیگئے ہیں۔

اگرچہ اس عرق ریزی اور خون فشانی کی حقیقی داد وہی دے سکتا ہے جو خود اُن شورزمینوں میں اشہب فکر کو جولاں کرے اور بہ "ہمیں مصیبت گرفتار آید" لیکن نمونے کے طور پر چند اشعار سنئے :-

مے عشرت نہیں طالع میں اپنے ساقیا ورنہ
فلک مینا لئے پھرتا ہے مہ ساغر لئے پھرتا

پیچ سے وہ کرتا یاری۔ باتیں اُس کی پیچ کی ساری
نکلیں اُسکے پیچ سے کیا ہم۔ پیچ کے اوپر پیچ پڑا
عشق ظفر ہے گورکھ دھندا اسکے کھولے پیچ کوئی کیا
ایک کھلا تو دوسرا محکم۔ پیچ کے اوپر پیچ پڑا

جو کہ ہے قسمت میں ہونا ہوگا آخر کو وہی
اے ظفر کیا شکوہ اس کا یوں ہوا یا دُوں ہوا

وہ نہ آیا یا رلائے یوں نہ تھا تو یوں ہوا
اُسکا آنا بن بلائے یوں نہ تھا تو۔ یُوں ہوا

اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

صبحدم گلشن میں آیا میکشی کو کیا وہ گل
ہر گل لالہ جو ہے یکدست ساغر سا بنا

گل ہی سے عارض گلگوں کو نہیں کچھ تشبیہ
قد موزوں بھی ہے اُس غنچہ دہن کا بوٹا

جو نہونا تھا ہوا ہم پر تمہارے عشق میں
تمنے اتنا بھی نہ پوچھا کیا ہوا کیونکر ہوا

چھپا کلی میں اسکے ہیں موتی کیا طلسم
چمکائے آفتاب نے انجم کرن کے گرد

حسرت ہے اُس اسیر قفس پر کہ جسکے پر
اُڑتے پھرے ہیں بعد فنا بھی چمن کے گرد

پھپھولے پاؤں میں ہیں نمایاں تو سر پہ داغ جنوں فروزاں
نہ دیکھیں دیوانے تیرے کیونکر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

تھا ہمیں منظور دکھلانا شکستِ دل کا حال لکھ کے جو خط شکستہ میں اُسے دکھلائے حرف
ہے عبث شکوہ ظفر واللہ اب اس چیز کا کھو دیا آپ ہی جسے اکبار اپنے ہاتھ سے

شمشیر برہنہ مانگ غضب بالوں کی مہک پھر ویسی ہے
جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا بالوں کی مہک پھر ویسی ہے
ہر بات میں اُسکی گرمی ہے ہر ناز میں اُسکے شوخی ہے
قامت ہے قیامت چال پری چلنے میں پھڑک پھر ویسی ہے
محرم ہے، حباب آب رواں سورج کی کرن ہے اُس پہ لپٹ
جالی کی کرتی ہے وہ بلا گوٹے کی دھنک پھر ویسی ہے
وہ گائے تو آفت لائے ہے ہر تال میں لیوے جان نکال
ناچ اُسکا اُٹھائے سو فتنہ گھنگھرو کی جھنک پھر ویسی ہے

آگے ظفر یہ حال تھا اپنا ہم غم سے گھبراتے تھے
ہو گئے غم کش ایسے اب ہمسے بھی غم گھبراتا ہے
بلا سے گر نہیں رکھتے تو ہم زر ہتیلی پر خدا کی راہ میں رکھتے ہیں اپنا سر ہتیلی پر

دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ عام فہم اور سلیس زبان میں واردات عشق و محبت بیان کرتے ہیں۔ اور اس رنگ میں جرأت کے ہم قدم ہیں مثلاً

پیرہن سے تیرے بو آتی ہے خوشبو کی ظفر ساتھ تو کون سے گلرو کے ہے سو کر آیا

شب رہا تھا کہیں ہے چشم جو مخمور تری ، باتیں چھوٹی نہ لبِ لب ہم سے گل اندام بنا

مری جانب سے غیروں نے لگایا کچھ نہ کچھ ہوگا نہ آیا وہ تو اُسکے دل میں آیا کچھ نہ کچھ ہوگا

سنا میں نے کٹی انکو بھی ساری رات آنکھوں میں کسی نے میرا افسانہ سُنایا کچھ نہ کچھ ہوگا

قسم خدا کی نہ مجھے قاصدا کہ یہ پیغام ، کہا ہے یار نے یا تو نے اپنے جی سے کہا

جسوقت نظر کوئی وہاں اور سے آتا اُسوقت مرے دل میں گماں اور ہے آتا

کوچے میں ترے تنہا ہر شب نہ مجھے ہو جانا دو چار گھڑی اپنا دل کھو لکے رہ جانا

کہتے ہو کہ جاتا ہوں مانع نہیں میں لیکن احوال جو ہے میرا تم دیکھ تو لو جانا

جواب خط کے نہ لکھنے سے یہ ہوا معلوم کہ آج سے ہمیں اے نامہ بر جواب ہوا

جب کہا میں نے میں موا تو کہا مرنے والوں کی دیکھنا صورت

آفریں آپ کے سُونے کو نہ جاگے اور ہم پس دیوار رہے گرم فغاں ساری رات

آپ کا چوری سے جانا کھل گیا شاید ظفر آج چرچا ہو رہا تھا اُنکے گھر والوں کے بیچ

مُنہ پر ہے تیرے لال ڈوپٹہ بوقت خواب یا روئے مہر پر ہے شفق سے نقاب سُرخ

دل کا ہو جائے ہے یہ رنگ ترے جانیکے بعد پھول جیسے نہ رہے کام کا کمھلانے کے بعد

ہم ہوئے شب کو یہ نالاں پس دیوار کہ بس کھول کر غرفہ لگے کہنے وہ ناچار کہ بس

تیری شوخی کے ہیں انداز سمجھنے مشکل چشم و ابرو ہیں وہی پر ہے اشارات میں فرق

خوف اپنوں کا ہے انکو ہمکو بیگانوں کا ڈر مل سکیں کیونکر کہ وہ مجبور ہم لاچار ہیں

لاکھ چاہت کو چھپائے کوئی پر چھپتی نہیں پیار کی آنکھ اور الفت کی نظر چھپتی نہیں

یہ ہے ہنگام گرمی بے حجابا نہ ذرا بیٹھو قبا کے کھول دو بند اب نہ شرماؤ ہوا کھاؤ

نہیں پہچانتے چاہت کی گر آنکھ ظفر کو دیکھ کر شرماتے کیوں ہو

تیسرا وصف یہ ہے کہ اپنے ماحول کے اثرات سے بے بس ہو کر کلیجے کے ٹکڑے صفحۂ قرطاس پر بکھراتے ہیں اور "پر بیتی" کی دردناک کہانی سے مجلس کو سوگوار بنا دیتے ہیں مثلاً

گرفتاری نصیبوں میں نہ ہوتی تو چمن سے ہیں　　بھلا اس طرح کیوں صیاد زیر دام آ جاتا

غم دل کس سے کہوں کوئی بھی غمخوار نہیں　　غم فرقت کے سوا
اور اگر پوچھے کوئی ۔ قابل اظہار نہیں ۔　　چپکا رہنا ہے بھلا
میں ہوں عاشق مجھے غم کھانے سے انکار نہیں　　کہ ہے غم میری غذا
تو ہے معشوق تجھے غم سے سروکار نہیں　　کھائے غم تیری بلا

بیاں کیجئے اگر احوال اپنی شام غربت کا　　گریباں تا بدامن چاک ہو صبح قیامت کا
گئی نہ مر کے بھی میرے نصیب کی گردش　　کہ سنگ قبر مرا سنگ آسیا ٹھہرا
دل کا کچھ کام نہ تجھ سے بت پرفن نکلا　　دوست جانا تھا تجھے جان کا دشمن نکلا

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا　　یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے　　کاش خاک در جانانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائق صحبت تو مجھے　　قابل جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوری ساقی سے مجھے　　تو چراغ در میخانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر　　ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

ستم ہے میں ہوں عین وصل میں ناکام جوں ساحل　　کہ لب ہیں خشک میرے اور ہے آغوش میں دریا
آ رہے ہے لب پہ حرف کئی جائے لیکے دم　　احوال مجھ سے پوچھے ہے بے طاقتی کا کیا
مرا تو حال ہونا آپ کی فرقت میں یونہیں تھا　　مجھے شکوہ نہیں تم سے میری قسمت میں یونہیں تھا
خاک ہو کر بھی گئی گردش نصیبوں کی نہ آہ　　خاک کو اپنی بگولے میں ہوا چکر نصیب
اے ظفر دوست ہیں آغاز ملاقات میں سب　　دوست پردہ ہے کہ جو شخص ہو انجام کو دوست

گوش گل تک میری فریاد تو پہونچے صیّاد ——— رکھ قفس کو مرے ظالم نہ گلستان سے دور

ہمدم و تم میری حالت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں ——— دیکھ لو چہرے کی رنگت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں

دیکھے اپنا دل ظفر اُس دشمن آرام کو ——— مجھپہ جو گذری مصیبت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں

منزل عشق بہت دور ہے اللہ اللہ ——— ایک ہی گام میں تم تھک کے ظفر بیٹھ گئے

چوتھا وصف یہ ہے کہ تصوف کی چاشنی سے آشنا ہیں۔ وحدت الوجود کے مسائل خوبی اور صفائی سے نظم کرنے میں حضرت نیاز بریلوی کے مدمقابل ہیں ملاحظہ ہو۔

بیچ میں پردہ دوئی کا تھا جو حائل اُٹھ گیا ——— ایسا کچھ دیکھا کہ دنیا سے مرا دل اُٹھ گیا

دیا اپنی خودی کو ہمنے اُٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا

ہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اُسکے سوا نہ رہا

ظفر آدمی اُسکو نہ جانیئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

جو عرش سے ہے فرش تلک سب اسی میں ہے ۔ دیکھ آنکھ کھول کر

کیا کیا نہیں ہے اسیں کہ سب کچھ اسی میں ہے ۔ پر چاہیئے نظر

کیوں کعبہ و کنشت میں سر مارتا ہے تو ۔ سرگرم جستجو

تو جسکو ڈھونڈھتا ہے چھپا وہ تجھی میں ہے ۔ پر تو ہے بے خبر

جلوہ اُسی کا دیر و حرم میں ہے اے ظفر ——— آتا نہیں ہے اسکے سوا کچھ نظر مجھے

جدھر آنکھ پڑتی ہے تو روبرو ہے ——— ترا جلوہ سب میں ہے سب جائے تو ہے

صدا پردۂ ساز کی یہ نہیں ہے ——— کوئی پردہ میں کر رہا گفتگو ہے

ظفر آپکو ڈھونڈھ مت ڈھونڈھ اسکو ——— وہ تجھ میں ہے جسکی تجھے جستجو ہے

شعلہ ہے وہی شمع وہی ماہ وہی ہے — خورشید وہی نور سحرگاہ وہی ہے

یوسف ہے وہی وہی زلیخا وہی یعقوب — کنعاں ہے وہی مصر وہی چاہ وہی ہے

مجنون و خراباتی و دیوانہ و ہشیار — درویش و گدا شاہ و شہنشاہ وہی ہے

خارا میں شرر ہے وہ ظفر لعل میں وہ رنگ — واللہ وہی سب میں ہے باللہ وہی ہے

صوفیوں میں ہوں نہ رندوں میں نہ میخواروں میں ہوں
اے بتو بندہ خدا کا ہوں گنہگاروں میں ہوں

میری ملت ہے محبت میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں میں کافروں میں خواہ دینداروں میں ہوں

جو مجھے لیتا ہے پھر وہ پھیر دیتا ہے مجھے
میں عجب اک جنس ناکارہ خریداروں میں ہوں

مے وحدت کی ہمکو مستی ہے — بت پرستی خدا پرستی ہے

پانچواں وصف یہ ہے کہ محاورہ بندی کا شوق غالب ہے۔ ہندی الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں اور فارسی ترکیبوں سے گریز کرتے ہیں ایک بڑا ذخیرہ ایسے الفاظ کا نظم کر دیا ہے جو نثر میں مستعمل تھے مگر شعرا کے کلام میں پائے نہیں جاتے۔

سر تلک دست ستم جو ہیں ترا قاتل بڑھا — خون جسم ناتواں تل تل گھٹا تل تل بڑھا

قیمت دل مری بازی محبت میں نہ پوچھ — یہ وہ سودا ہے کہ ہرگز نہیں چکتا ہوگا

ہم سے ہر بات پہ اکھڑے ہے تو یوں او ظالم — نہیں معلوم تجھے غیر نے کیونکر گانٹھا

کل سمجھ لونگا ظفر اس سے جو وہ آئیگا ہاتھ — آج دھوکا دیکے مجھ کو کیا ہوا چنپت بنا

کیا لکھتے تھے خط وہ پلنگ پر بیٹھے — مجھے جو دیکھا چھپا یا تو اڑ ہیں کاغذ

الٰہی خیر ہو پکڑا گیا ہے واں قاصد — قبول دے نہ کہیں مار دھاڑ میں کاغذ

آبرو تیری ابھی خاک میں ملجائیگی　　دیدۂ تر سے نہ رو دکش ہو پر ہٹ بدلی

شرط رونیکی جو اِن چشم سے جھٹ پٹ بدلی　　دل برسنے سے گھٹا کر گئی پھر ہٹ بدلی

شوق سے گھر میں مرے رات کو آیا کیجئے　　برق سی ہے یہ لئے ہاتھ میں ڈپٹ بدلی

حسرت و درد و الم رنج و تعب اندوہ و یاس　　ساتھ دل کے دیکھا میں نے جمع کیا ڈھالے ہوئے

تھے عدم میں جب تلک واقف نہ تھے جھگڑوں سے ہم　　آکے ہستی میں یہ سب معلوم جھگڑے ہوئے

اُڑ گئی صیاد اب دل سے ہوس پرواز کی　　بٹھا رہنے دے قفس میں ہم کو پر جھاڑے ہوئے

جو کچھ کہنا تھا وہ کہدیا ظفر اُس سے　　بھڑاس دل کی وہاں ساری میں نکال آیا

گو نہ جائے گی سواری آپکی غیروں کے گھر　　گھوڑے کاغذ کے یہیں سے بیٹھے دوڑائینگے آپ

مزا چکھا یا ہے کوہکن کو یہ عشق آیا جو امتحاں پر

کہ لایا تو جوئے شیر لیکن چھٹی کا دودھ آگیا زباں پر

ظفر دل لیگیا مجھ کو گلی میں اس پریوش کے　　وگرنہ اب تلک تو واں فرشتہ بھی نہ پھٹکا تھا

ان محاسن کے ساتھ کچھ عیوب بھی ہیں :-

اول یہ کہ زبان قدیم اور الفاظ متروک پر اصرار کرتے بلکہ کبھی کبھی غلط الفاظ اور نا جائز ترکیبوں سے بھی احتراز نہیں کرتے ہیں۔

اشک کو ٹک دیکھ کر اے دیدۂ تر بیچنا　　جوہری بازار میں مت تو یہ گوہر بیچنا

کوہکن کا کب نقط پتھر میں لوہو جم گیا　　کچھ تو شیشے میں جما کچھ سر میں لوہو جم گیا

کچھ پوچھو نہ بات اُس بت بیرحم کی مجھ سے　　شربت بھی دم نزع نہ ٹک آکے پلایا

بتوں کی سنگدلی نقش کالحجر ہے ہمیں،　　یہ سچ ہے مٹ نہیں سکتا ہے داغ پتھر کا

دیکھ روتے جو مجھے آیا ظفر رحم اُسے　　ہنس کے وہ میرے گلے زور پھبن سے لپٹا

ناوک افگن تیری الفت نے دکھائیں آنکھیں　　روزن اک در ہوا روزن سینہ کے قریب

خون جو آیا جوش پر بعد از شہادت کے مری　　بنگیا سرآخر ش کو متصل دھڑ کے حباب

لب دریا پہ کشتی میکشی کی ہو کہ اے ساقی　　بنا ہر اک حباب بحر جو گیلاس پانی پر

اُسوقت کے امیروں سے ہوگا سوا لئیق　　شاہ جہاں و شاہ جہانگیر کا خواص

دیدۂ تر پہ مرے سایۂ مژگان کو دیکھ　　مردماں بولے کہ آئی شب گھنگھٹ بدلی

کمینے بھی لگے اب شعر کہنے کیا تماشہ ہے　　کہ مضمون بندی ان رنڈوں چھپر بندی لگی منہ نے

دوسرے یہ کہ معاملہ بندی کی ہوا میں کبھی اسقدر پستی اور رکاکت کی طرف جھکتے ہیں کہ "پشت پائے خود نہ بینم"، کا مقولہ صادق آتا ہے۔

گئے تھے کہاں دھبے کس جا لگے ہیں　　نیا کل کا اوڑھا دوشالا بگاڑا

پکڑا جو ہاتھ اُسکا میں نے ظفر ہنسی سے　　کس کسطرح چھڑایا اُس نے پکڑ کے پہونچا

اے ظفر افسوس واں ہرگز گلی اپنی دال　　گو شت شب اب حسرت سے مرا یاں گل گیا

ہوا ہے شیخ جی تم کو تو بے طرح سے زکام　　بہا کرے ہے تمھارے دماغ سے دریا

یاد آئی مجھ کو محرم اُس پری کی اے ظفر　　آب جو میں جبکہ دیکھے زور کے تڑکے حباب

بزم میں کتنوں کے منہ لال ابھی کر دونگا　　پان غیروں کو مرے آگے گل اندام نہ بھیج

ہاتھ چھاتی پہ جو نہیں ہینے لگایا تو کہا　　سخت کیا ہاتھ ہیں تیرے یہ نگوڑے پتھر

گئی بوسے مقرر کر کئے دینے نہ مجھے تم نے　　تو کیا صاحب حساب دوستاں دردل نہوگا

پھیر کر منہ جو دکھایا نہ مجھے اپنے جوڑا　　دل پہ مکا مرے اُس رشک پری نے مارا

شب تو آدھی کٹ گئی خطرہ نہ لاؤ کون ہے　　شوق سے آؤ پلنگ پر لیٹ جاؤ کون ہے

علاوہ ان دو معائب کے رعایت لفظی کا ذوق اور سستی بندش کی مثالیں سارے کلیات میں موجود ہیں اور تازگی مضامین مفقود ہے۔ بااینہمہ محاسن کا پلہ معائب سے گراں تر ہے اور کلام کی فراوانی نے نقائص پر پردہ ڈال دیا ہے۔ آخری زمانہ کا کلام تلف

ہونے کے بعد بھی تقریباً تیس ہزار اشعار کا ذخیرہ موجود ہے اور اس مجموعہ سے ایک دیوان مختصر ایسا تیار ہو سکتا ہے جو سرتاپا مرصع ہو۔ لہٰذا یہ دعویٰ بالکل صحیح طور پر کیا جا سکتا ہے کہ خم خانۂ جاوید میں ظفر اپنے استاد شاہ نصیر سے بلند تر نشست پر رونق افروز رہنے کے مستحق ہیں۔

طرز سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے ۔۔۔ اسکے سخن سے یہاں کسی کا سخن لگا

ظفر کے سیکڑوں اشعار کتاب میں نقل کئے جا چکے۔ مخمس۔ مسدس۔ قصیدے کا انداز بھی دکھایا گیا۔

اب چند قطعات خاتمہ پر درج کئے جاتے ہیں :۔

گلی میں یار کی ہم آج شب کو اے ہمدم ۔۔۔ بتائیں کیا کہ کدھر سے گئے کہاں سے گئے
صبا کی طرح سے آنکھوں میں سب کے ڈال کے خاک ۔۔۔ نظر بچا کے ہر اک واں کے پاسباں سے گئے

رات دن ہمکو رہِ ملک عدم کا ہے خیال ۔۔۔ ساتھ کیا لیجائینگے اُس رہگذر کے واسطے
کر چکے برباد سب زادِ عمل اپنا یہیں ۔۔۔ حیف ہے رکھا نہ کچھ ہمنے سفر کے واسطے

رقعۂ شوق کو مرے قاصد ۔۔۔ نہ کسی کو دکھا کے لیجائے
کہیں ایسا نہ ہو مرے خط کا ۔۔۔ کوئی مضموں اُڑا کے لیجائے

تم جو کہتے ہو کہ دن کو ہوتا ہے افشائے راز ۔۔۔ گھر میں میرے اے ظفر تو شوق سے آ رات کو
اپنے دربانوں سے یہ کہہ دو ہمیں ٹوکیں نہیں ۔۔۔ ورنہ ہو جائیگا در پر مفت دنگا رات کو

مانند نکہت گُل عمر اپنی اس چمن میں ۔۔۔ کی جس طرح سے ہمنے برباد کچھ نہ پوچھو
جو کچھ ہے حال میرا صورت ہی سے عیاں ہے ۔۔۔ کیا پوچھتے ہو میری روداد کچھ نہ پوچھو

بزم عالم میں بہم شادی و غم ہیں دونوں ۔۔۔ ایک ہنستا ہے ظفر ایک ہے یاں گریاں
دیکھ لے آنکھ سے گر ساغر مے ہنستا ہے ۔۔۔ ہچکیاں لے کے ہے شیشہ بھی مقرر روتا

سب کے تم آشنا ہو پر تم کو بحر الفت میں ہے ظفر سے بیَر
فی الحقیقت یہ ہے مثل وہ ہی رہنا دریا میں اور مگر سے بیَر

ہو گی کیا اسپہ گذرتی کہ سنان مژگاں ہے ستمگر دل مجروح ظفر میں چبھتی
دیکھ ہو جاتا ہے کیا جسم سراپا بے چین جب کوئی پھانس ہے انگشت بشر میں چبھتی

پوچھے جو کوئی مجھسے کہوں اس حقیقتاً نزدیک میرے بھی یہی رائے صواب تھی
جلدی سے اُٹھ کے محفل رنداں سے شیخ جی اچھا ہوا چلے گئے صحبت خراب تھی

ہم اُنکے گھر میں جائیں اور اُنکے پاس کیا بیٹھیں نہ غمازی ہمیں آتی ہے نے جاسوسی آتی ہے
گزارا اے ظفر واں تو اُنھیں لوگونکا ہوتا ہے کہ جن کو چاپلوسی اور کانا پھوسی آتی ہے

بجز خون دل محزوں بجز چشم و دل پُر خوں نہ پاس اپنے ہے گلگوں نہ ساغر ہو نہ صہبا ہے
ظفر میخانۂ عالم میں ہمکو ایک مدت سے نہ مستی کی ہوس نے مے پرستی کی تمنا ہے

وہ ہمسے وعدہ کر جاتے ہیں اکثر شب کے آنیکا مگر آتے نہیں ہرگز کہ جا کر بھول جاتے ہیں
گذر جاتی ہے ساری رات گنتے کہتے یہ ہمکو اب آتے ہیں اب آتے ہیں اب آتے ہیں اب آتے ہیں

جب کہا میں نے چھپاؤ مت مجھے معلوم ہے اب تلک سوتے تھے پیارے تم جہاں کل کیے پڑے
بولے ماتھا کوٹ کر آخر کہا ہی پر کہا نوج تیرے کان بات اے پیٹ کے ہلکے پڑے

مدت کے بعد حضرت ناصح کرم کیا فرمائیے مزاج مقدس کی بات چیت
پر ترک عشق کے لئے ارشاد یہ کچھ نہ ہو میں کیا کروں نہیں یہ مرے بس کی بات چیت

پڑھتا ہوں ایک مطلع و مقطع میں حسب حال دیکھے تماشے مینے جو مُلک وجود کے
اکدن وہ تھا کہ ٹوٹے نہ تھے دانت دودھ کے پھر یہ ہوا گذرنے لگے کھیل کود کے
اب ہے یہ حال عالم پیری میں اے ظفر باقی نہیں حواس ہیں گفت و شنود کے

ظفر کو باز رکھ اعمال بد سے ‏ ‏ خطا بخشا۔ کرم گارا۔ الٰہا
صرفت العمر فی لہو و لعب ‏ ‏ فا ٰہا۔ ثم ا ٰہا۔ ثم ا ٰہا

خط جسے چاہو لکھو تم لیکن ‏ ‏ اتنا بندے پہ کرم کیجئے گا
وہ جو القاب لکھا ہے مجھ کو ‏ ‏ وہ کسیکو نہ رقم کیجئے گا

کیا کہوں کیسا وہ گھبرائے ہیں بیٹھے بیٹھے ‏ ‏ میں نے شب گھر میں جو اُنکے کوئی کنکر پھینکا
اُٹھکے بھاگے یہی کہکر کوئی ہاں جاؤ شتاب ‏ ‏ دیکھو کسنے پس دیوار سے پتھر پھینکا

کچھ نہ پوچھو دل بیتاب کا میرے احوال ‏ ‏ میں نے پہلو سے نکال اسکو جو باہر پھینکا
پاؤں پر اُس بت سفاک کے وہ یوں تڑپا ‏ ‏ کرکے جوں ذبح کسی نے ہو کبوتر پھینکا

اے حضرت دل جاؤ گر زلف کے کوچے میں ‏ ‏ تو مجھکو بھی ساتھ اپنے دنیا سے نہ کھو جانا
اُس شوخ پریرو کی تم دیکھتے ہی صورت ‏ ‏ سودائی نہ بنجانا۔ دیوانہ نہو جانا

اے ظفر ایک ہے تو فن سخن میں اُستاد ‏ ‏ کیوں نہ قائل ہوں ترے ناسخ و آتش دونوں
بلکہ گر ہوتے ظہوری و نظیری بھی آج ‏ ‏ کرتے ہر شعر کو سنکر ترے عش عش دونوں

یہ اگر سچ ہے کہ ہوتی دل کو دل سے راہ ہے ‏ ‏ کیوں نہیں ہوتا پھر الفت کا اثر دونوں طرف
ہم جو ہوں یاں مضطرب وہ بھی ہاں بیتاب ہوں ‏ ‏ چاہیئے تاثیر ہوئے اے ظفر دونوں طرف

کلیاتِ ظفر

بادشاہ کے پانچ دیوان تھے لیکن دفتر پنجم آشوب غدر میں ضایع ہوگیا اور اب رائج الوقت کلیات میں صرف چار دیوان ہیں۔

پہلا دیوان زمانۂ ولی عہدی کی تصنیف ہے۔ اسکا بیشتر حصہ ۱۲۲۳ھ یا ۱۲۲۴ھ میں شیخ ابراہیم ذوقؔ کی شاگردی شروع ہونے سے پہلے مرتب ہو چکا تھا مگر تفکرات اور تہید ستی کی بدولت مدت تک شایع نہو سکا۔ سنہ ۹ جلوس میمنت مانوس (۱۲۶۱ھ) میں پہلی مرتبہ مطبع سلطانی واقع قلعہ معلّٰی میں چھپا۔

اس دیدہ زیب ایڈیشن کا ایک نسخہ کتب خانۂ سرکاری ریاست رامپور میں موجود ہے اور اسکے سرورق پر مندرجۂ ذیل عبارت نواب کلب علیخاں مرحوم کے دست خاص کی لکھی ہوئی ہے

نسخۂ ہذا بتاریخ بستم رجب ۱۲۶۵ھ از جائے بطریق تحفہ نزد عاصی محمد کلب علی آمد،

ہرگز نرفت برہ من سروے بالاتر از دمیکہ ایں نسخۂ بہاریں یافتم"

نواب خلد آشیاں اسوقت ولی عہد تھے۔ بادشاہ کا دیوان پاکر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار جن مختصر اور معنی خیز الفاظ میں کیا ہے اُن سے ظفرؔ کی عزت و توقیر میں افزایش نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ خود نواب کاتب کی سخن فہمی۔ نکتہ سنجی اور قدر شناسی کی دلیل روشن ہیں

جزاک اللہ خیر الجزا۔

اس دیوان میں علاوہ غزلیات اور قطعات کے ۹ مخمس۔ ۶ مسدس اور ۲۰ مثلث شامل ہیں۔ فی الحقیقت ظفر کا بہترین کلام اسی دیوان میں ہے۔ بادشاہ کا دوسرا دیوان ۱۲۶۶ھ (۱۳ جلوس) میں مطبع سلطانی سے شایع ہوا۔ اس میں علاوہ غزلیات کے ایک سلام۔ ایک مرثیہ اور چھ مخمس ہیں۔

غدر کے بعد اس دیوان ثانی کی ایک کاپی لکھنؤ پہونچی اور شیخ قادر بخش مالک مطبع "اودھ گزٹ محلہ حسین گنج در کوٹھی غلام حسین" نے ۱۲۷۶ھ (مطابق ۱۸۶۰ء) میں شایع کیا دیوان اول کا کوئی مکمل نسخہ شیخ قادر بخش کو دستیاب نہ ہو سکا۔ چند غزلیں اس دیوان کی میسر آئی تھیں لہذا "انتخاب دیوان اول" کے نام سے اس دیوان کیساتھ بطور ضمیمہ کے چھاپی گئیں مالک مطبع نے خاتمہ پر لکھا ہے کہ

"بصد وقت صرف ایک نسخہ مطبوعہ دہلی برائے کتابت ہاتھ آیا۔ وقت مطالعہ غلط پایا۔ شائقین کا شوق بدرجہ کمال دیکھا۔ دوسرا نسخہ سردست ممکن ہونا محال دیکھا ناچار مطابق نسخہ مذکور کے چھپوایا"

دیوان سوم اور دیوان چہارم بھی غدر سے پہلے مطبع سلطانی سے شایع ہوئے تھے ان میں بھی علاوہ غزلیات اور قطعات کے سلام اور مخمسات ہیں۔ دیوان چہارم میں چند رباعیات بھی ہیں۔ ایک رباعی سنئے۔

کاٹتے دن ہیں جو ہم باعث غم گن گن کے
شب بھی کرتے ہیں بسر تاروں کو ہم گن گن کے
کوئے جاناں کی زمیں اپنے پکڑتی ہے پاؤں
ہم ظفر اسلئے رکھتے ہیں قدم گن گن کے

سب سے پہلے مطبع مصطفائی دہلی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اسنے بادشاہ کے چاروں دیوان ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۲ء) میں یکجا شایع کئے۔ اور اہل ملک کی قدردانی سے چند روز میں

فروخت ہو گئے۔ منشی نولکشور لکھنوی نے ۱۸۶۹ء میں اسی مجموعہ کی منشی امیر اللہ تسلیم سے تصحیح کرائی اور اپنے مشہور مطبع سے ۱۸۷۰ء میں کلیات مروجہ کا پہلا ایڈیشن شایع کیا۔

کلام ظفر کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ چند روز میں کل کاپیاں بک گئیں اور بازار سے ھل من مزید کی صدا آنے لگی۔ کلیات دوبارہ چھپا۔ سہ بارہ چھپا۔ اور ۱۹۱۸ء میں پانچویں بار طبع ہوا۔ افسوس ہے کہ ہر ایڈیشن میں غلطیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اور اب مروجہ دیوان کا کوئی ورق اغلاط سے خالی نہیں ہے خدا کسی عالی ہمت کو توفیق دے کہ وہ اس کلیات کو دواوین مطبوعہ قلعۂ معلی سے مقابلہ کر کے شایع کرے اور کلام ظفر کو دوبارہ زندگی نصیب ہو۔

دیگر تالیفات ظفر

بادشاہ نے زمانۂ ولی عہدی میں ایک کتاب "لغت اور اصلاح دکن" کی تین جلدوں میں لکھ کر ۱۲۲۶ھ میں تمام کی تھی۔ شرح گلستان سعدی کے دیباچے میں ظفر نے اس تالیف کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اسکا نام "تالیفات ابوظفری" تھا۔ افسوس ہے کہ زمانہ کے انقلاب سے یہ گنج شایگاں برباد ہو گیا اور آج اس عالمانہ تالیف کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

شرح گلستان ۱۲۵۹ھ (سنہ ۶ جلوس) میں مطبع سلطانی سے شایع ہوئی تھی مگر ہنوز نایاب نہیں ہے یہ عجیب و غریب کتاب علم تصوف میں ہے۔ شیخ سعدی کی عبارات اور گلستاں کی حکایات سے مسلہ وحدت الوجود کو ثابت کرنیکی سعی بلیغ کی ہے ضمن کلام میں دوسرے فقر او ربزرگوں کے حالات بھی درج کئے ہیں۔ اسکا تاریخی نام "ضیایان تصوف" ہے نام کی شان نزول یوں تحریر فرماتے ہیں:

بعد از تنظیم ایں سلک لآلی آبدار تفرج کناں از مقام موتی محل داخل محل معلی گردیدم و قطعہ تاریخ اتمام کتاب کہ ہم نام از طریق تخرجہ بحصول می انجامد بدینگونہ از جیب عدم سر برآورد

بنوشت ولی عہد شہ اکبر ثانی — این شرح گلستاں پے بتیاں تصوف
چوں کرد قلم لفظ "بجر" دور بر آمد — تاریخ مع نام خیابان ۔ تصوف

۱۲ — ۱۲۱۴۰ ۱۲ = ۱۲۲۸

شرح کے خاتمہ پر ایسی دل پسند عبارت لکھی ہے کہ ہم اسی پر کتاب ختم کرتے ہیں

این گلدستۂ عرفان یعنی شرح گلستان بہ نسیم عنایت نخلبند خیابان جہان مطابق مشرب ارباب وحدۃ الوجود بوجود رسید و بہ لطف پاک مالک تبدا داختتام باختتام انجامید

رباعی

این شرح ز طبع ناقصم کامل شد — ختمش برحسب مدعائے دل شد
صد شکر کن اے ظفر کہ از فضل خدا — بر خاتمہ بالخیر ظفر حاصل شد

الٰہی بہ مقبولان توحید بنیان این سواد را مقبول مقبولان خود گردان و بہ محبوبان وحدت نشان این مصنف را بمقام محبوب محبوبان خویش برسان

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین